

مرا آقا اعروں سے ایامی ناول تک

”مرا آقا اعروں“، ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا ناول درحقیقت اس زمانے کی تخلیق ہے جب انگریز کی فوجی قوت اس بر صفائی میں رہنے والوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً دہشت ناک تسلط جما چکی تھی۔ حریت، حمیت و شجاعت اور ملی اقدار کے تحفظ کی بات کرتے ہوئے جس کے بارے میں سنایا کسی مخبر نے خبر دی اسے فواد ملی کے معروف ”خونی دروازہ“ میں نصب کردہ سوئی پر چڑھا دیا گیا۔

ایسے حالات کے دفاعی عمل میں ملی تعلیمات کے عملی تقاضوں اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والے ایک گھرانے کے باشموراہل قلم ڈپٹی نذیر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی روایات، اقدار اور تعلیمات کے تحفظ کے لیے غیر مرمنی الناظ اور قلم کی تلوار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس معتبر مخلوق کے پر دکیا جس کی گودا قوام ملک کی نصف محافظت ہوتی ہے بلکہ اس کی عمار بھی ہوتی ہے۔

انہوں نے قلم اور الناظ کی اس تلوار کو ناول کے خدوخال دے کر ایسا حسن دیا کہ سانپ بھی مر جائے اور الہی بھی نہ ٹوٹے۔ اس تلوار کی دھار کو گورتوں کی زبان کی چاشنی دی۔ محاورات سے جایا، روایات کی روشنی دی۔ اس کے کردار کو ایسی زندگی دی کہ جو بھی ان سے ملاستی کا ہو لیا۔

ان کی اپنی بیٹی سکینہ اس ناول سے ابتدائی مرحلہ ہی میں نہ صرف خود متاثر ہوئی بلکہ اپنی ہمیلیوں میں سے بھی مرا آقا اعروں کے کردار اکبری اور اصغری کے ثابت اور منفی متأنگ سے متعارف کرایا بس انہی کا ہو لیا۔ تعلیم کے فائدے اور جہالت کے نقصانات اور ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کے تقاضوں کا احساس قلم اور الناظ میں اس طرح ڈھالا کر ملی کے شرفاء کا کوئی گھرانہ ایمان تھا جہاں مرا آقا اعروں موجود ہو بعد ازاں ۱۸۸۹ء میں مرا آقا اعروں طبع ہو کر جب مخلوں میں عام ہو گئی تو ڈپٹی نذیر احمد نے چونکہ بطور حکمت اس میں ملکہ و کشوریہ کی تعریف میں چند سطور بھی شامل کر دیں جس کے نتیجہ میں مرا آقا اعروں پر انہیں انگریز سرکار نے انعام بھی دیا۔

ہفتہ انتہا

ڈپٹی نذیر احمد نے محسوس کیا کہ خواتین کے لیے سرف گھر بیوی تعلیم ہی نہیں بلکہ علوم متداولہ بھی ضروری ہیں لہذا انہوں نے مرا آقا اعروں کے بعد یہ ناول تحریر کیا۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی اصغری ہے۔ اصغری نے مکتب کا آغاز نواب خاندان کی ایک بُڑی ہوئی بچی حسن آرے کیا۔ جو اصغری کے ماتحت میں آنے کے بعد ایک مثالی لڑکی بن گئی۔ اصغری نے اپنے

ڈھب پر یوں تو سینکڑوں شاگرڈ لکیاں تیار کیں لیکن محمودہ اصغری کا تربیت یافتہ مکمل شاہکار بے جور شتے میں اس کی نند بھی بے۔ اس کتاب میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، علوم اکنامیں (امور خانہ داری) معاشیات، نفسیات، زندگیات، سیاسیات سمجھی علوم موجود ہیں۔

توبۃ الصو ح

اس ناول کا نام قرآن حکیم کی ایک آئیت سے اخذ کیا گیا ہے، جس کا منہوم یہ ہے کہ اُتیٰ توبہ جس کے بعد گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

ڈپٹی نذری احمد چونکہ ادب برائے اصلاح کے قائل تھے انہوں نے یہ ناول اپنے مخصوص اسلوب میں ایسے والدین کے لیے قلم بند کیا جو بچے پیدا تو کرت رہ لیکن ان کی تربیت و تہذیب اسلامی سے غافل رہ جس کے نتیجے میں کلیم (شاعر مزان، آوارہ شطرنج باز) جوان ہوا۔ دوسرا عالم جو اچھے برے سے واقف تھا لیکن گھر میلوں ماحول کی وجہ سے اسی ڈھب پر پابڑھا۔ سب سے چھوٹا سلیم اپنے نیک دوستوں کی وجہ سے کھیل کوڈ آوارہ گردی سے دور رہا اور دینی اقدار کا پابند بن گیا۔ دو بیویوں میں سے فہمیدہ شادی شدہ الھمہ مزان، خندی، سست اور چھوڑ بھی تھی۔ جب کہ چھوٹی بچی ابھی صرف چند سال کی تھی۔ ایسے میں طاعون کے حملہ سے نصوح جب بچ گیا۔ تو اس کے دل میں آخرت کا احساس ابھر آیا اپنی ذمہ داری کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے اصلاح خانے کے لیے سب سے پہلے بیوی کو ہمنوا بنا لیا۔ میاں بیوی نے اپنے بچوں کو کن مشکلات کے بعد دینی خطوط پر چلنے کے لیے آمادہ کیا یہ ایک صبر آزماء، انتہائی کٹھن، داستان بے۔ جو اس ناول کے کرداروں میں گھومتی نظر آتی ہے۔

اس ناول کا مرکزی خیال تربیت اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں بے۔ یہ ناول 1877ء میں شائع ہوا۔

فسانہ بتایا

ڈپٹی نذری احمد نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ان کی تیش پسندی، لبوواہب میں انبہاک اور زندگی کے سنجیدہ حقوق سے تغافل بے۔ وہ اپنے باتھ سے محنت کرنے کے بجائے باپ وادا کی کمائی اور جھوٹی آکرتوں پر گزارہ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جب بچے کی تربیت غلط ہوتی ہے اور لبوواہب کا رسیا ہو جاتا ہے میاں اور بیوی مختلف مزان ہوتے ہیں۔ تو گھر کا گھر تباہ ہو جاتا ہے۔ بتایا ایک ایسا ہی خندی اور بگڑا ہوا بچہ تھا۔ جس کے والدین مر چکے تھے۔ بیوی بھی معاملہ فہم نہیں تھی۔ اسے طوائف کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ بلا آخراً ایک طوائف سے شادی کر لی دونوں بیویوں کی

چپکلش کے نتیجے میں ایک روز کسی مپرتی کی حالت میں مر گیا۔ اس ناول میں میر ثقیٰ کا کردار ایک مصلح کا کردار یہ جو بتا کوئی خواہاں نصیحت کرتا رہتا ہے۔

ابن الوقت

یہ ناول ڈپٹی نذری احمد نے 1888ء میں لکھا جب کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان روز بروز انگریز کی نقلی میں اپنی اقدار کو کھو رہے ہیں۔ انگریز کی بحوثتی نقلی میں نہ تو وہ صاحب ہن سکے اور نہ ہی مسلمان ربے۔ ابن الوقت اس ناول کا مرکزی کردار ایک اتنی قسم کا آدمی ہے۔ اس ناول میں یہ تغییب دیگئی ہے کہ انگریز کی نقلی کی بجائے اپنی اقدار پر جنتے ہو۔ البتہ ان کی زبان ان کے عالم سیکھ کر دنیاوی ترقی ضرور حاصل کرو۔

رویائے صادقہ

اس ناول میں ڈپٹی نذری احمد نے دین اسلام کے مختلف اعقیدہ اور مختلف فتنہیں مکاتب فکر کو اعتدال کی راہ بھانے کی کوشش کی ہے اس ناول کا مرکزی کردار ایک سمجھدار مسایقہ مند اور ذہین اڑکی صادقة ہے جو علمی گرذہ یونیورسٹی سے نٹھے ہوئے تھنٹھلک ذہن شوہر کو اس کے مختلف سوالات کے بارے جواب دے کر مطمئن کرتی ہے اور بالآخر اس کا ذہن دین اسلام کے بارے میں صاف و شفاف ہو جاتا ہے۔

ایامی

جبیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈپٹی نذری احمد کا یہ ناول بیوگان کی دوسری شادی اور ان کی اصلاح احوال کے متعلق تھا۔ لیکن معلوم نہیں کہ واب دستیاب بھی ہے یا نہیں؟

محمد مسعود عبدہ

تمہید کے طور پر عورتوں کے لکھنے پڑھنے کی ضرورت اور ان کی حالت کے مناسب کچھ اصیحتیں

جو آدمی دنیا کے حالات میں کبھی غور نہیں کرتا اس سے زیادہ کوئی حق نہیں۔ غور کرنے کے واسطے دنیا میں بزراؤں طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا اپنا خیال ہے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے، زندگی میں اس کو کیا باتیں پیش آتیں اور کیوں کراس کی حالت بدلا کرتی ہے۔

انسان کی زندگی میں سب سے اچھا وقت لڑکپن کا ہے۔ اس عمر میں آدمی کو کسی قسم کا فکر نہیں ہوتا۔ ماں باپ نہایت شفقت اور محبت سے اس کو پالتے ہیں اور جہاں تک بس چلتا، اس کو آرام دیتے ہیں۔ اولاد کے اچھا کھانا، اچھا پہنچ سے ماں باپ کو خوشی ہوتی ہے بلکہ ماں باپ اولاد کے آرام کے واسطے اپنے اوپر تکمیل اور رنج تک کو گوارا کر لیتے ہیں۔ مرد جو باپ ہوتے ہیں، کوئی محنت مزدوری سے کاتے ہیں، کوئی پیشہ کر کے، کوئی سوداگری، کوئی نوکری۔ غرض جس طرح بن پڑتا ہے اولاد کی آسائش کے واسطے روپے کے پیدا کرنے میں کوتا ہی نہیں کرتے۔ عورتیں جو ماں ہوتی ہیں۔ کوئی ماں سلامی کا کام سیکتی ہے، کوئی گوٹا بنتی ہے، کوئی ٹوپیاں کاڑھتی ہے یہاں تک کہ کوئی مصیبت کی ماری ماں چند کات کر، چکی پیس کر، ماما گیری کر کے بچوں کو پالتی ہے۔ اولاد کی محبت جو ماں کو ہوتی ہے، ہرگز بناوٹ اور ظاہرداری کی نہیں ہوتی بلکہ بچی اور دلی محبت بے اور خدائے تعالیٰ نے جو بڑا دانا ہے یہ متنا اس لیے ماں باپ کے پیچھے لگادی ہے کہ اوپا درپورش پائے۔ ابتدائے عمر میں بچے نہایت ہے۔ بس ہیں، نہ بولتے نہ سمجھتے، نہ چلتے نہ پھرتے۔ اگر ماں باپ محبت سے اولاد کونہ پالتے تو بچے بھوکوں مرجاتے۔ کہاں سے ان کو روٹی ملتی، کس طرح کپڑا بھم پہنچاتے اور کیوں کر بڑے ہوتے؟ آدمی پر کیا موقف ہے؟ جانوروں میں بھی اولاد کی مامتاب بہت سخت ہے۔ مرض بچوں کو دن بھر پروں میں چھپائے بیٹھی رہتی ہے اور ان کا ایک دانہ بھی اس کو ماتا ہے تو آپ نہیں کھاتی؛ بچوں کو بالا کر چوچنے سے ان کے آگے سر کا دیتی ہے اور اگر نیلی یا بلی اس کے بچوں پر حملہ کرنا چاہتے تو مطلق اپنی جان کا خیال نہ کر کے لڑنے اور مرنے کو مجبود ہو جاتی ہے۔ غرض ہونہ ہو یہ خاص محبت ماں باپ کو سرف اسی لیے خدا نے دی ہے کہ ننھے ننھے بچوں کو جو ضرورت ہوائی گی نہ رب۔ بھوک کے وقت کھانا اور پیاس کے وقت پانی۔ سردی سے بچنے کو گرم کپڑا اور ہر طرح کی آرام کی چیزوں قوت متنا سب پر مل جائے۔ دیکھنے سے ایک بات یہ بھی

معلوم ہوتی ہے کہ یہ پھر اس وقت تک رہتی ہے جب تک بچوں کو اس کی ضرورت احتیان ہوتی ہے۔ جب مرٹ کے پچ بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ ان کو پروں میں چھپانا چھوڑ دیتی ہے اور جب بچے چال کر پھر کرانا پیش بھرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو مرٹ کچھ بھی ان کی مد نہیں کرتی بلکہ جب بہت بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کو اس طرح مارنے کو دوڑتی ہے گویا وہ ان کی ماں نہیں۔ آدمی کے ماں باپ کا بھی یہی حال ہے جب تک بچہ ہوتا ہے ماں دودھ پالتی ہے اور اس کو گود میں لادے لادے پھرتی ہے۔ اپنی نیند خراب کر کے بچے کو تھپک تھپک کر سلاتی ہے۔ جب بچا تناسیتا ہوا کہ کچھ زی کھانے لگا، ماں دودھ بالکل جھٹڑا دیتی ہے اور وہی دودھ جس کو برسوں پیار سے پالتی رہی، ختنی اور بے حسی سے نہیں پینے دیتی۔ کڑوی چیزیں لگائیتی ہے اور بچہ خند کرتا ہے تو مارتی اور گھر کتی ہے چند روز کے بعد بچوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ گود میں لیما تک تا گوار ہوتا ہے۔ کیا تم نے اپنے چھوٹے بھائی بہن کو اس بات پر مار کھاتے نہیں دیکھا کہ ماں کی گود سے نہیں اترتے۔ ماں خفا ہو رہی ہے کہ کیسا نہ ہموار بچہ ہے کہ ایک دم نہیں چھوڑتا۔ ان باتوں سے یہ مت چھوکہ ماں کی محبت نہیں رہی۔ نہیں نہیں محبت تو ویسی ہی ہے مگر ہر حالت کے ساتھ ایک خاص طرح کی محبت ہوتی ہے اولاد کا حال یکساں نہیں رہتا۔ آن دودھ پیتے ہیں، کل کھانے لگے پھر پاؤں چھنا سیکھا۔ بچہ جتنا بڑا ہوتا گیا، اسی قدر محبت کارنگ بدلتا گیا۔ اور زیادہ بڑے ہو کر اڑ کے اور اڑ کیاں پڑھنے اور لکھنے اور کام کرنے کے واسطے ماریں کھاتے ہیں۔ اگر چہ بے وقوفی سے بچے نہ سمجھیں مگر ماں باپ کے ہاتھوں سے جو تکالیف بھی تم کو پہنچو وہ ضرور تباہارے اپنے فائدے کے واسطے ہے۔ تم کو دنیا میں ماں باپ سے الگ رہ کر بہت دنوں جینا پڑے گا۔ کسی کے ماں باپ تمام عمر زندہ نہیں رہتے خوش نصیب ہیں وہ اڑ کے اور اڑ کیاں جنہوں نے ماں باپ کے جیتے جی ایسا بغیر اور ایسا ادب سیکھا جس سے ان کی تمام زندگی خوش اور آرام میں گزری، اور نہایت بد قسمت ہے وہ اولاد جنہوں نے ماں باپ کی زندگی کی قدر نہ کی اور جو آرام ماں باپ کی وجہ سے ان کو میسر ہوا اس کو اکارت اور ایسے اچھے فراغت اور بے فکری کے وقت کوستقی اور کھیل کو دیں خلاج کیا۔ عمر بھر نجاح و مصیبت میں کافی۔ آپ غذاب میں رب اور ماں باپ کو اپنے سبب غذاب میں رکھا۔ مر نے پر کچھ موقوف نہیں شادی بیاہ ہوئے پیچھے اولاد مان باپ سے جیتے جی چھوٹ جاتی ہے۔ اڑ کوں اڑ کیوں کو ضرور سوچنا چاہیے کہ ماں باپ سے الگ ہوئے پیچھے ان کی زندگی کیوں کر گزرے۔

دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں کے سر پر ہے۔ کھانا، کپڑا اور روزمرہ کے خرچ کی سب چیزیں روپے سے حاصل ہوتی ہیں اور سارا کھڑا اگ روپے کا ہے۔ عورتوں کو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر روپیہ پیدا کرنے کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں۔ مردوں کو دیکھو روپے کے لیے کیسی کیسی سخت مختیں کرتے ہیں۔ کوئی بھاری بوجھ سر پر اٹھاتا ہے، کوئی لکڑیاں چیرتا۔

سنار، او بار، نھیں، کسیرا، کندل، گر، زر کوب، دکبی، تارکش، ملچ ساز، جزیا، سلمہ ستار و دوالا، پیہ، جلد ساز، بینا ساز، قاعہ گر، سادو گر،
 صیقل گر، آئینہ ساز، زر دوز، منھیار، انعل بند، مگنیز ساز، کامد افی، والا، انسان گر، نیار یا، ڈھلیہ، بڑھی، خراوی، ناریل والا، لٹھی ساز،
 بنس پھوڑ، کاغذی، جولا ہا، رنگ گر، رنگ ری، چھپی، دستار بند، درزی، علاقہ بند، پچ، مہر کن، سگ تراش، حکاک، عمار،
 و بکر، کمبار، حلوائی، تیل، تنبولی، رنگ ساز، گندھی وغیرہ جتنے پیشے والے ہیں، کسی کا کام جسمانی اور دماثی تکمیل سے خالی
 نہیں، اور روپے کی خاطر یہ تمام تکالی مددوں کو سنبھالنے اور اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن اس بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ عورتوں کو
 کھانے اور سورہ بننے کے سواد نیا کا کوئی کام مطلق نہیں بلکہ خانہداری کے تمام کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ مدد اپنی کمائی عورتوں کو
 کے آگے لا کر کھو دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقول سے اس کو بندو بست اور سلیقے کے ساتھ اٹھانی ہیں۔ پس اگر غور سے دیکھو تو
 دنیا کی گاڑی میں جب تک ایک پہیہ مدد اور دسر اعورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی۔ مددوں کو روپیہ کمانے سے اتنا وقت نہیں پختا
 کہ اس کو گھر کے کاموں میں صرف کریں۔ اے لڑکو! وہ بات سیکھو کہ مدد ہو کر تمہارے کام آئے اور اے لڑکیو! ایسا بخیر
 حاصل کرو کہ عورت ہونے پر تم کو اس سے خوشی اور فائدہ ہو۔ بے شک عورت کو خدا نے مدد کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا
 ہے۔ لیکن با تھپاؤں، آنکھوں یا داشت، سوق سمجھ سب چیزیں مددوں کے برادر عورتوں کو دی گئی ہیں۔ لڑکے ان ہی چیزوں
 سے کام لے کر ہر فن میں طاق اور ہر نظر میں مشاہد ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں اپنا وقت گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی
 ہیں۔ ولیسی ہی بے بن رہتی ہے اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا۔ ہر سیکھا، لیاقت
 حاصل کی وہ مددوں سے کسی بات میں بیٹھنے نہیں رہیں۔ ملکہ و کٹوریہ کو دیکھو، عورت ذات ہو کر کس دھوم اور کس شان اور کس
 تاموری اور کس عمدگی کے ساتھ اتنے بڑے ملک کا انتظام کر رہی ہیں کہ دنیا میں کسی بادشاہ کو آن تک یہ بات نصیب نہیں۔
 جب ایک عورت نے سلطنت جیسے کٹھن کام کو اور سلطنت بھی ماشاء اللہ اس قدر وسیع اور ایسے نازک وقت کہ بات منہ سے
 لکھی اور اخبار والوں نے بتگلڑ بنا لیا، اتنی مدت دراز تک سنبھالا اور ایسا سنبھالا کہ جو سنبھالنے کا حق ہے۔ تو اب عورتوں کی
 خداداد تابیت میں کام کرنا نری ہے وہری ہے۔

بعض نادان عورتیں خیال کرتی ہیں کہ کیا لکھ پڑھ کر ہم کو مددوں کی طرح نوکری کرنی بے لیکن اگر کسی عورت نے لکھ پڑھ
 لیا ہے اور اس نے نوکری نہیں کی تو اس کا لکھنا پڑھنا اکارت بھی نہیں گیا۔ اس کو اور بہترے فائدے پہنچ جن کے مقابلے
 میں نوکری کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ جو لوگ علم کو صرف نوکری کا وسیلہ سمجھ کر پڑھتے ہیں ان کو علم کی قدر نہیں۔ سچ پوچھو تو علم
 کے آگے نوکری ایسی ہے جیسے سودے کے ساتھ روکھن۔ کہاں سے قوت بیان لائیں کہ تم کو علم کے فائدے سمجھائیں۔ ظاہر
 کی دو آنکھیں تو ہمارے تمہارے سب کے منہ پر ہیں۔ کبھی انہی فقیروں کی دعا سنو۔ کس حسرت سے کہتے ہیں۔ ”بابا

آنکھیاں بڑی نعمت ہیں۔ ”شاید کوئی بھی ایسا سنگ دل نہ ہو گا جس کو انہوں کی معنوں والے اور بے کسی پر حم نہ آتا ہو، لیکن دل کے اندر ہے جن کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا ان سے کہیں زیادہ قابلِ رحم ہیں۔ انگریزوں کی ولایت میں تو انہوں کی تعلیم کا ایسا عمدہ انتظام بے کہ اندر ہے ٹول ٹول کر اچھی طرح اخبار اور کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے اندر ہے بھی بعض ایسے بلا کے ذہین ہوتے ہیں کہ سوئی پروئیں سیئیں، اکیلے سارے شہر کے گلی کو چوں میں بے دھڑک دوڑے دوڑے پھریں۔ لھوٹا کھرا روپیہ پر کھیں۔ قرآن شریف کا حذف کر لیا تو اندر ہے کے لیے گویا، ایک معمولی بات ہے۔ خدر سے پبلے پبلے شہر میں گفتگو کے دو چار ما درز ادا اندر ہے معاوی بھی تھے۔ غرض آنکھوں کا اندر ہا ہونا مصیبۃ ہے، مگر نہ ایسی کہ جیسے دل کا اندر ہا (یعنی جاہل ہونا) افسوس کوئی دل کے نقصانات سے اونگ و اونٹ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ عالم و فاضل ہونا تو درکنائز ہزار پچھے ایک بھی پڑھا لکھا نظر نہیں آتا۔

یہ تو مردوں کا مذکور ہے، جن کو پڑھ کر رونی کمانی ہے۔ عورتوں میں پڑھنے لکھنے کا چرچا اس قدر کم بے کہ دلی جیسے غدار شہر میں اگر مشکل سے سوسا سو عورتیں وہ بھی شاید حرث شناس نہیں بھی تو اس کو چہ پانہ نہیں کہ سکتے۔ پھر اگر چہ چانہ ہو تو خیر پنداش مضا لئے کی بات نہیں۔ مصیبۃ تو یہ بے کہ اکثر عورتوں کے لکھانے پڑھانے کو نیب اور گناہ خیال کرتے ہیں ان کو خدا شہر یہ بے کہ ایسا نہ ہو لکھنے پڑھنے سے عورتوں کی چار آنکھیں ہو جائیں۔ لیکن مردوں سے خط و کتابت کرنے اور خدا خواستہ کل کالاں ان کی پاک دائمی اور پرودہ داری میں کسی طرح کافتوروں اُتھے ہو۔ یہ سرف شیطانی وہ ہو سے ہیں اور ملک کی خصوصاً عورتوں کی بدعتی اُگوں کو بہکا اور بھڑکا رہی ہے۔ اول تو ہم ایک ذریتی بات یہیں پوچھتے ہیں کہ علم انسان کی اصلاح کرتا ہے یا ایسا کو بگاڑتا اور خرابی کے لچھن سکھاتا ہے؟ اگر بگاڑتا ہے تو مردوں کو بھی پڑھنے لکھنے کی منا ہی ہوئی چاہیتے تاکہ گبڑے نہ پائیں اور مرد گبڑیں گے تو کبھی کبھی ان کا بگاڑ عورتوں میں اڑ کرے گا پر کرے گا۔ دوسرے انصاف شرط ہے۔ بے شک بعض پڑھنے لکھنے مرد بھی آوارہ بدوضع ہوتے ہیں۔ لیکن کیا علم نے ان کو آوارگی اور بدوضعی سکھائی؟ نہیں نہیں، آوارگی اور بدوضعی انہوں نے بری صحبت میں سکھی یا کھلبی اور کوڑھ کی طرح ان کو کوڑ کر لگی اور پڑھ لکھ کر ان کی برائی، مثلاً چھٹا نک بھر بتو نہ پڑھنے کی صورت میں یقین جانو ضرور سیر سیر ہوتی۔ باس یہم، مثلاً سو پڑھنے لکھوں پر نظر ڈالو تو کوئی اکا دکا شامت زدہ خراب ہو تو ہو ورنہ خدا نے چاپا تو اکثر نیک، بھلے مانس، مان باپ کا ادب کرنے والے بھائی بھنوں سے محبت رکھنے والے بڑے کو بڑے اور چھوٹے کو چھوٹے کی جگہ سمجھنے والے دنگے فساد اور بری صحبت سے دور بھاگنے والے روزے رکھنے والے، سچ بولنے والے، غریبوں پر ترس لکھانے والے، غصے کے پی جانے والے، بزرگوں کی نصیحت پر چانے والے، لحاظ شرم والے، جیسا کھانا کپڑا میسر آیا شکر گزاری کے ساتھ لکھانے والے ملیں گے۔ ہماری بھی

ساری نمراء یہی لوگوں میں گزری بے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ جو شخص علم کو بد نام کرتا ہے، آسمان پر تھوکتا ہے اور چاند پر خاک ڈالتا ہے۔ بے شک بعض برے لوگوں نے بری کتابیں بھی دنیا میں پھیلادی ہیں اردو میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں سلسلہ درس سے خارج اور ان کا پڑھنا اور سننا کیا مرد کیا عورت سب ہی کے حق میں زبان ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ آنکھ بری جگہ بھی پرستی بے یا زبان سے بعض ناواقف کو سئے، جھوٹ بولتے، گالیاں کہتے، بلا ضرورت قسم کھاتے یا لوگوں کے پیچے پیچھے ان کی بدیاں روتے ہیں جس کو غیبت کہتے ہیں، نہ آنکھیں پھوری جاتی ہیں نہ زبان کافی جاتی بے۔ تو صرف علم نے کیا قصور کیا بے کہ ایک انو اور بے اصل احتمال کی بنیاد پر عورتوں کو اس کے بے انتہا دینی اور دنیاوی فائدوں سے محروم رکھا جائے؟ کیا اتنا نہیں ہو سکتا کہ بے ہود کتابوں کو مستورات کی نظر سے نہ گزرنے دیں؟ علاوہ بریں آدمی کے دل کو خدا نے بنایا بے آزاد۔ جب انسان کو کسی پر مجبور کیا جائے تو وہ چاروں ناچار اس کام کو کرتا ہے، مگر نہ اس عمدگی اور خوبی کے ساتھ جیسا کہ خود اپنے دل کے تناضے سے۔ کہاں تو دوسروں کی زبردستی اور کہاں اپنا شوق۔ مثلاً بڑ کے بعض تو وہ ہیں جن کو خود پڑھنے کا مطابق شوق نہیں۔ اس واسطے کرنا دن ہیں بے سمجھ ہیں۔ اتنا نہیں جانتے کہ آنکو جی لگا کر پڑھ لکھ لیں گے تو بڑے ہوئے پیچھے ہمارے ہی کام آئے گا۔ دنیا میں ہماری عزت و آبرو ہو گی۔ دنیا اور دین دونوں میں ہمارا بھلا ہو گا۔ تو ایسے بدشوق بڑ کے کبھی خوشی سے مدرسے نہیں جاتے۔ گھروالوں نے زبردستی دھکیل دیا یا مکتب کے بڑ کے آئے اور ناک کر لے گئے۔ زبردستی گئے بے دلی سے بیٹھے رہتے، چھٹی مان، نہ کچھ پڑھانے لکھا، کورے والوں سے بے کہنے بے بھیجئے بے آئے۔ دوسرے قسم کے بڑ کے وہ ہیں جن کی قسمت میں خدا نے کچھ بہتری لکھی بے وہ آپ سے بے کہنے بے بھیجئے بے بalaے وقت سے پہلے مدرسے کو دوڑے چلے جاتے ہیں۔ جاتے ہی آموختہ پڑھا، مطالعہ کیا، سبق لیا اور آخروقت تک اس میں لگے لپٹے رہتے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ان دونوں قسم کے بڑ کوں میں کس سے امید کی جاسکتی ہے کہ لکھ پڑھ کر امتحان پاس کرے گا، مگر بیٹھے اس کو نوکری کے لیے بالا وے آئیں گے۔ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ بے شک جس کو شوق بے اتنی کوئی قوت بے۔

اسی طرح ہماری عورتوں میں جیا پاک دائمی پروردہ داری، نیکی جو کچھ تجوہ خدا کے فضل و کرم سے بہتر ہی بے۔ مگر بر امانویا بھلا مانو، ابھی تک بے مجبوری کی۔ یعنی مذہب اور ملکی روان اور مردوں کی حکومت نے عورتوں کو زبردستی نیک بنا رکھا ہے لیکن اگر خود عورتوں کے دل میں نیکی کا تناضنا ہو تو سبحان اللہ نور علی نور۔ ایک تو سونا کھرا، اوپر سے ملا بھاگ، کیا کہتا ہے۔ مگر دل سے نیکی کے تناضے کے پیدا ہونے کے علم کے سوا اور کوئی تدیر ہی نہیں۔ بس جو لوگ عورتوں کو علم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ گویا ان کو سچی اور حقیقی اور پاکیزہ اور بے اوث اور کھری اور پائیدار نیک دلی سے روکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

کے عورتوں کو خدا نے جاہل رہنے کے لیے نہیں بنایا۔ جس حالت میں عورتیں اب ہیں، اس کے لیے انہیں اتنی عقل کی کیا ضرورت ہے؟ بس خدا نے جو عورتوں کو اتنی ساری عقل دی ہے ضرور کسی بڑے کام کے لیے دی ہے۔ یعنی، علم حاصل کرنے کے لیے۔ لیکن اگر عورتیں عقل سے علم حاصل کرنے کا کام نہ لیں۔ تو ان کی مثال ایسی ہو گی جیسے ہندوؤں کے جو گی جو اپنا ہاتھ سکھا کر مصلحتِ الہی کو باطل کرتے ہیں۔ کیوں صاحب ہاتھ کا خشک اور بے کار کر دینا بہتر یا اس کو نیک کام میں لا کر دنیا کا فائدہ اور دین کا ثواب حاصل کرنا بہتر؟ مسلمانوں کی تشنیق کے لیے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ہونٹیں سکتی کہ رسول اللہ ﷺ کی بیسیوں میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سر برآ وردہ تھیں۔ ایک دن دونوں پیغمبri ہوئی باتیں کر رہی تھیں کہ رسول پاک ﷺ آنکھے اور حضرت عائشہؓ کی طرف اشارہ کر کے حضرت حفصہؓ سے بیان فرمایا کہ ان کو بھی لکھنا سکھاؤ۔ ہر چند پر دو تشنیق کی وجہ سے دنیا کے بہت سے کام عورتوں کو معاف ہیں لیکن پھر بھی خیال کرو تو عورتیں زیٰ نکمی نہیں ہیں۔

خانہ داری بدوں عورت کے ایک دن نہیں چال سکتی۔ مرد کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو مگر ان نہیں کے عورت کی مدد کے بدوں گھر چاہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے مرے کو خانہ دیرانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس اگر دنیا کے کسی کام میں بھی بکار آمد ہے تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ خانہ داری کے اتنے بھاری کام میں جو مردوں کے سنبھالے نہ سنبھلے بکار آمد نہ ہو۔ پر یوں کہو کہ لوگوں کو اپنے معاملات پر غور کرنے اور سوچنے کی عادت نہیں۔ اگلے لوگ برقی یا بھلی جو راہ نکال گئے ہیں، انہیں دانہیں دانہیں کچھ نہیں دیکھتے۔ بھیڑوں کی طرح اس پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ خانہ داری منہ سے کہنے کو تو ایک لفظ ہے، مگر اس کے معنی اور مطلب پر نظر کرو تو پندرہ بیس کے فرق سے خانہ داری اور دنیا داری ایک ہی چیز ہے۔ خانہ داری میں جو کام کرنے پڑتے ہیں ان کی فہرست منضبط نہیں ہو سکتی۔ شادی، ننھی، تفریبات، مہمان داری، لین دین، نسبت نامہ، پیشنا، پکانا، سینا پر دنا، خدا جانے کتنے بکھیرے ہیں، جس نے گھر کیا ہوا تو کچھ خبر ہو گی۔ لیکن اس خانہ داری میں اولاد کی تربیت بھی ہے۔ اور کسی کام میں عورتوں کو علم کی ضرورت نہ بھی ہو، مگر اولاد کی تربیت تو جیسی چاہیے بے علم کے ہونی ممکن نہیں۔ اڑکیاں تو بیا وہ تک اور اڑ کے اکثر دس برس کی عمر تک گھروں میں تربیت پاتے ہیں اور ماوں کی خوبیوں میں اٹر کر جاتی ہے۔ پس اے عورتو! اولاد کی اگلی زندگی تمہارے اختیار میں ہے۔ چاہو تو شروع سے ان کے دلوں میں ایسے اونچے ارادے اور پاکیزہ خیال بھر دو کہ بڑے ہو کر نام و نمود پیدا کریں اور تمام عمر آسانی میں بسر کر کے تمہارے شکر گز اڑ رہیں! اور چاہو تو ان کے افتاد کو ایسا بگاڑو کر جوں جوں بڑے ہوں خرابی کے لمحن سکھتے جائیں اور انجام تک اس ابتداء کا تاسف کریں۔ اڑکوں کو بولنا آیا اور تعلیم پانے کا مادہ حاصل ہوا۔ اگر ماوں کو یا قلت ہو تو اسی وقت سے بچوں کو تعلیم کر چلیں۔ مکتب یا

مرے سے بھینتے کے انتظار میں لڑکوں کے کئی برس ضائع ہو جاتے ہیں۔ بہت جھوٹی عمر میں نہ تو خود لڑکوں کو مدد سے جانے کا شوق ہوتا ہے اور نہ ماوں کی محبت اس بات کو گوارا کرتی ہے کہ نہنے نہنے بچے جوا بھی اپنی ضرورتوں کے ضبط پر قادر نہیں ہیں اس تاد کی قید میں رکھے جائیں۔ لیکن اگر ماں نیں چاہیں اسی وقت میں ان کو بہت کچھ سکھا پڑھادیں۔ لڑکے مرے سے میں بھینتے کے بعد بھی مدتوں تک بے دلی سے پڑھا کرتے ہیں اور کہیں بہت دنوں میں ان کی استعداد کو ترقی ہوتی ہے۔ اس تمام وقت میں ان کو ماوں سے ایشیا بہت مدد ملتی ہے۔ اول تو ماوں کی تی شفقت اور دل سوزی کیا؟ دوسرا رات دن کا برادر پاس رہنا، جب ذرا طبیعت متوجہ دیکھی جبٹ کوئی حرف پہنچا دیا۔ یا کچھ گفتگی یا دکرداوی۔ کہیں پورپ پچھم کا اقیاز بتا دیا۔ ماں نیں تو باتوں باتوں میں وہ سکھا سکتی ہیں اور ماوں کی تعلیم میں ایک یہ کتابڑا الطف ہے کہ لڑکوں کی طبیعت کو جشت نہیں ہونے پاتی اور شوق کو ترقی ہو جاتی ہے۔ اولاد کی تہذیب ان کی پرورش کی مدیر، ان کی جان کی حفاظت ان کے اختیار میں ہے۔ اگر خدا نخواستے کہیں اس سیاقے میں کی ہو تو اولاد کی زندگی معرضِ نظر میں ہے۔ ایسا کون کم بخت ہو گا جس کو ماوں کی محبت میں کام ہو۔ لیکن وہی محبت اگر نادانی کے ساتھ برقراری جائے تو ممکن ہے کہ بجائے نفع کے اثاثاتِ حسان پہنچائے۔ ذرا انصاف کرو، کیا بزراروں جا بل اور کم عتمل مانیں ایسی نہیں ہیں جو اولاد کے ہر ایک مرض کو نظر گزرا اور پر چھانوں اور جھپٹا اور آسیب سمجھ کر بجائے دوا کے جھاڑ پھونک اتار کیا کرتی ہیں؟ ورنہ مناسب علاج کا اثر تم ہی سمجھ لو کیا ہوتا ہو گا۔ عرض یہ ہے کہ کل خانہداری کی بلکہ یوں کہو کہ دنیا داری کی درست موقوف بے عتمل پر عتمل کی علم پر۔ اس بات کو ہر کوئی تسلیم کرے گا کہ عورت میں سب سے بڑا بہر یہ ہونا چاہیے کہ جس کے پلے بندھی ہے، آپ اس سے راضی رہے اور اس کو اپنے راضی اور خوش رکھے۔

تم نے بہشت اور دوزخ کا نام سنایا۔ بیچنچ کی دوزخ اور بہشت تو دوسرے جہان کی چیزیں ہیں، مرے پیچھے ان کی حقیقت کھلے گی۔ لیکن ان کی شکلیں گھر گھر دنیا میں موجود ہیں اور ان کی پہچان کیا ہے؟ میاں بی بی کے آپس کا پیار و اخلاص۔ جس گھر میں میاں بیوی محبت اور سازگاری سے زندگی بسر کرتے ہیں، بس سمجھ لو کہ ان کو دنیا ہی میں بہشت بے اور اگر آئے دن کی لڑائی بے جگہ رابطہ یا اس سے خفا، واس سے ناراض توجانو دنوں جیتے جی جہنم میں ہیں۔ سازگاری کے ساتھ ساری مصیحتیں انگیز کی جاسکتی ہیں بلکہ اس کی ایذا ایک محسوس نہیں ہوتی اور سازگاری نہیں تو زندگی میں کچھ مزدہ داری نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سازگاری کے لیے عورتوں کو زیادہ اہتمام کرتا ہو گا اس لیے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا پالا بالکل ہلکا ہے۔ کچھ راہ چلتے کی صاحب سلامت نہیں کرتم روٹھے ہم چھوٹے بلکہ مرنے بھرنے کا تعلق ہے۔ سازگاری پیدا کرنے کے لیے جو تدبیریں عورت کے اختیار کی ہیں، ان سب میں بہتر سے بہتر ہمارے سمجھنے کی لیاقت ہے۔ لڑکیاں شرم

کے مارے مند سے نہ کہیں لیکن دل سے تو ضرور جانتی ہیں کہ کوارپیٹ کے دن تھوڑے ہیں۔ آخر بیاہی جانئیں گی۔ بیاہ پیچھے بالکل نئی طرح کی زندگی بس رکنا پڑتی ہے، جیسا کہ تم ماں اور نانی اور خالہ اور کنہے کی تمام عورتوں کو دیکھتی ہو۔ کوارپیٹ کا وقت تو بہت تھوڑا ہے۔ اس وقت کا اکثر حصہ تو بے تمیزی میں گزر جاتا ہے۔ وہ پیاری زندگی تو آگے آ رہی ہے جو طرح طرح کے جگہوں اور انواع و اقسام کے بکھیروں سے بھری ہوئی ہے۔ اب تم غور کرو کہ تم کوئی انوکھی لڑکی تو ہونیں کہیاں ہوئے پیچھے تم کو کچھ اور بھاگ لگ جائیں گے۔ جو دنیا جہاں کی بہو بیٹیوں کو پیش آتی ہے وہ تم کو بھی پیش آئے گی۔ پس سوچنا چاہیے کہ بیاہ ہوئے پیچھے عورتیں کس طرح پر زندگی بس رکتی ہیں، کیسی ان کی عزت کی جاتی ہے، کہاں تک مردان کی خاطر داری کرتے ہیں۔ خاص طور پر لوگوں کی حالت پر غور مت کرو۔ بعض جگہ اتفاق سے زیادہ ملابہ ہوا، غورت مرد پر غالب آگئی اور جہاں زیادتاً موافقت ہوئی، عورت کا دفتر بالکل اٹھ گیا۔ یہ توبات ہی الگ ہے۔ ملک کے عام دستور اور عام روانہ کو دیکھو۔ سو عام دستور کے موافق ہم تو عورتوں کی کچھ خاص قدر دیکھتے نہیں۔ ناقصات العقل تو ان کا خطاب ہے۔ تریا ہٹ تریا چہ ترمدوں کے زبان زد عورتوں کے مکر کی نہست قرآن میں موجودان کیہد کن عظیم یعنی مرد لوگ عورتوں کی ذات کو بے وفا جانتے ہیں۔

اسپ و زن و ششیر و فادر کہ دید
ایک شاعر نے عورتوں کی وجہ تسمیہ میں بھی ان کی نہست پیدا کی ہے۔

اگر نیک بودے سر انجام زن

زنان رامزن نام بودے نہ زن

یہ سب باتیں کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ خانہ داری کے بر تاؤ میں دیکھو تو گھر کی ٹہل خدمت کے غالا و دنیا کا کوئی عمدہ کام بھی عورتوں سے لیا جاتا ہے یا کسی عمدہ کام کے صلاح یا مشورے میں عورتیں شریک ہوتی ہیں؟ جن گھروں میں عورتوں کی بڑی عزت اور بڑی خاطر داری ہے، وہاں بھی جب عورت سے پوچھا جاتا ہے تو یہی ”کیوں نی“، آن کیا تر کاری کے گی؟ لڑکی کے لیے ٹالے بانی جوئی ملکوادگی یا ڈیڑھ حاشیہ کی؟ جھالیلہ ماںک چندی اونگی یا جہازی؟ زردہ پورنی لینما منظور ہے یا امانت خانی؟ رضائی کو اودی گوٹ لگے گی یا سرمنی؟ اس کے سوا کوئی عورت بتا دے کہ کبھی مردوں نے اس سے بڑی باتوں میں صلاح لی بے یا کوئی بڑا کام اس کے اختیار میں چھوڑ دیا ہے؟ پس اے عورتو! کیا تم کو ایسے برے حالوں میں جینا ناخوش نہیں آتا؟ اپنی بے اعتباری اور بے وقاری پر افسوس نہیں ہوتا؟ کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ مردوں کی نظر میں تمہاری عزت ہو، تمہاری عقول پر ان کو اعتماد اور بھروسہ ہو؟ تم نے اپنے باتھوں اپنا وقار کھا ہے۔ اپنے کارن نظروں سے گری ہو، تم

کو تباہیت ہو تو مردوں کو کب تک خیال نہ ہو گا؟ تم کو لیاقت ہو تو مردوں کو کہاں تک پاس نہ ہو گا؟ مشکل تو بے کہ تم صرف اسی روئی والی پکائیں اور پھٹا پراناتی لینے کو لیاقت سمجھتی ہو۔ پھر جیسی لیاقت ہے، ویسی قدر بنے۔ تمہاری اس بالعمل کی حالت اور جہالت پر ایک بد عقلی اور ایک مکروہ فریب کیا اگر دنیا بھر کے الزام تم پر لگائے جائیں تو واجب اور سارے جہان کی برائیاں تم میں نکالی جائیں تو بجا۔

اے عورتو! تم مردوں کے دل بہلاوا اور ان کی زندگی کا سرمایہ یعنیش، ان کی آنکھوں کی بہار و باغ، ان کی خوشی کو زیادہ اور ان کے غم غلط کرنے والیاں ہو۔ اگر تم کو مردوں سے بڑے کاموں کے انتظام کا سلیقہ ہو تو مرد تمہارے پاؤں دھنودھو کر پیا کریں اور تم کو اپنا سرستا نہ بنا کر رکھیں۔ تم سے بہتر ان کا غم گزار تم سے بہتر ان کا صلاح کا، تم سے بہتر ان کا خیر خواہ اور کون ہو گا۔ لیکن بڑے کاموں کا سلیقہ تم کو حاصل ہو تو کیوں کر؟ گھر کی چار دیواری میں تو تم قید ہو۔ کسی سے ملنے کی تم نہیں۔ کسی سے بات کرنے کی تم نہیں۔ عقل ہو یا سلیقہ، آدمی سے آدمی سیکھتا ہے۔ مردوں کو پڑھ لکھ کر عقل و سلیقہ حاصل کرتے ہیں اور جو لکھے پڑھنے نہیں وہ بھی ہزاروں طرح کے لوگوں سے ملتے، میں سے میں قسم کی باتیں سنتے ہیں۔ اس پر دے سے تم کو نجات کی امید نہیں۔ بہت کچھ ہمارے ملکی دستور اور روانت نے اور کسی قد رندہ بہب نے پر دشمنی کو عورتوں پر فرض و واجب کر دیا ہے اور اب اس روانت کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ پس سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کیا تدبیر بنے کہ تمہاری عتملوں کو ترقی ہو؟ بلکہ مردوں کی نسبت عورتوں کو پڑھنے لکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ مردوں تباہر کے چلنے پھرنے والے لٹھبرے۔ لوگوں سے مل جل کر بھی تجربہ حاصل کر لیں گے۔ تم گھر میں بیٹھی بیٹھی کیا کرو گی؟ سینے کی بیٹھی سے عقل کی پڑیا نکال اوگی یا اتنا کی کوٹھڑی سے تجربے کی جھوٹی بھرا لو گی؟ پڑھنا لکھنا سیکھو کہ پر دے میں بیٹھے بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر لیا کرو۔ علم حاصل کرو کہ گھر کے گھر میں زمانے بھر کی باتیں تم کو معلوم ہوا کریں۔ پھر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ دنیا ان ہی چند گھروں سے عبارت نہیں ہے جس میں تم رہتی ہو یا آتی جاتی ہو اور نہ دلی یا ان تحوڑے سے شہروں سے عبارت ہے جن کے نام تم نے سئے ہیں۔ خیر تمام دنیا کے حالات بیان کرنے کا تو یہ محل نہیں۔ تم کو شوق ہو تو پڑھ لکھ کر جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں کی سیر کرنا۔ تب جانو گی کہ دنیا کتنی بڑی ہے۔ کیسے کیسے رو بدل اس میں ہوتے آئے ہیں۔

بہر کیف، اس وقت کا یہ رنگ بے کہ سارے ہندوستان پر انگریز قابض ہیں۔ ان لوگوں میں مرد، عورت، امیر، غریب، نوکری پیشہ، سوادگر، بہل حرفہ، کاری گزر میں دار، کاشت کار سب کے سب پڑھ لکھے ہوتے ہیں اور اسی سے خدا نے ان کو ترقی دی ہے کہ کہاں ان کی ولایت اور کہاں ہندوستان۔ چھ سات ہزار میل کا فاصلہ اور تین میں سمندر۔ مگر علم کے زور سے اس ملک میں آئے، علم ہی کے زور سے اس کو اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ چاہار بے ہیں کہ روئے زمین کی کسی سلطنت میں

ایسا امن و انصاف اور ایسا انتظام نہیں۔ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ داش مند منصف اور خدا تر س با دشاد کو رسیت اپنی او ماد سے بڑھ کر پیاری ہوتی ہے۔ پس اگر یہ جس دن اس ملک میں آئے، اسی دن سے اس بات کے پیچھے پڑے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ لکھیں پڑھیں، لیاقت حاصل کریں کہ ان کا افلاس دور ہو۔ ظلم زبردستی کرنا تو انگریزوں کا دستور نہیں مگر جہاں تک تجھانے سے لائچ دکھانے سے ہو سکتا ہے علم کو ترقی دے رہے ہیں۔ گاؤں گاؤں مدرسے بخواہیے ہیں۔ پڑھنے والوں کو ٹینے اور انعام دیجئے جاتے ہیں۔ جو لوگ امتحان پاس کرتے ہیں ان کو نوکری ملتی ہے۔ سو خدا کے نعل سے اتنا تو ہواب کہ لکھنے پڑھنے کا بہت روان ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے۔ یہی ایک ڈھنگ ہے تو کوئی دن کو ہوبنی سقے، مزدور تک لکھنے پڑھنے لگیں گے۔ بھالا بچر آن پڑھا اور جائل اشراف لوگوں کی مردوں یا عورت کی اعزت باقی رہ جائے گی؟ انگریزی عمل داری میں بزراروں قسم کی نئی چیزیں چل پڑی ہیں۔ ان میں سے ایک عجیب اور بڑے کام کی ریل بے جس کی وجہ سے مہینوں کے رستے گھنٹوں میں طے کیے جاتے ہیں اور وہ بھی کس سہولت اور آسانی کے ساتھ کہ سفر کا سفر اور تفریح کی تفریح۔ یہی سبب ہے کہ لوگ جیسے پر دلیں کے کام سے گھبراتتے تھے، اب سفر کے لیے بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ ہماری یاد کی بات ہے کہ جب کوئی حج کا ارادہ کرتا تو یہ سمجھ کر گھر سے نکلتا کہ بس مجھ کو لوٹ کر آنا نہیں۔ یا اب ریل اور دھانی جہازوں کے طفیل میں یہ حال ہو گیا ہے کہ ذیلقد میں گھر سے نکلے، محرم کے آخر ہوتے ہوتے کے مدینے دونوں کی زیارت کر کے اصل خیر سے آمو ہو دیوئے۔ اور لوگوں میں تو خیر مگر نوکری پیش تو شاذ و نادر کوئی گھر کے گھر موبہود ہو ورنہ جس کو سنو پر دلیں۔ لیکن پر دلیں سے آپس کے اعلقات تو نہیں چھوٹتے۔ ایک بار بڑے دن کی تعطیل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ذرا گور کچپور اور دلی کے فاسلے تو دیکھوا اور با وجدو یہ کہ گور کچپور سے دلی تک برادریل نہ تھی، آٹھ دن کی چھٹی میں آنے جانے کو اور پورے پانچ دن دلی میں شہر نے کوڈیکھو بھلے کو انگریز کی عمل داری ہو گئی تھی کہ ہم نے بھی یہ آرام دیکھیے ہیے۔ خیر تو عرض یہ کہ چھٹی میں دلی آیا ہوا تھا کہ ایک بی بی اپنے میاں کے نام خط لکھوا نے آئیں۔ بتانی گئیں، میں لکھتا گیا۔ بہت سی باتیں ان کے مند تک آتی تھیں مگر لحاظ کے مارے کہ نہیں سکتی تھیں۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ان کو سمجھایا کہ خدا نے تمہاری روزی تو اتری پر دلیں میں اور پر دلیں بھی میئنے دو میئنے کا نہیں بلکہ ساری عمر کا۔ اس سے تم آپ لکھنا کیوں نہیں سیکھ شیئیں؟ تو وہ بڑی حرست کے ساتھ کہنے لگیں، بھالا کہیں اب میری عمر لکھنا سکھنے کی بے؟ بال بچوں کے بکھیرے میں پندرہ پندرہ دن گزر جاتے ہیں کہ سر دھونے کی نوبت نہیں آتی۔ بچپن میں قرآن پڑھاتا۔ خیر شکر ب استانی جی کی برکت سے بھوا تو نہیں مگر مشکل سے گھڑیوں میں جا کر ایک مہینا بھی چھوڑ دوں تو سارا قرآن سپاٹ ہو جائے۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ جب تم کو قرآن یاد بے تو لکھنا سیکھ ایما کوئی بڑی بات نہیں۔ ہر روز تو تم پڑھ لیتی ہو گی۔ وہ بولیں، باں،

کچھ یوں ہی تی انک انک کراور اکثر لفظ رو جاتے ہیں۔ مگر چھپا ہوا خاصی طرح سے نکال لیتی ہوں۔ میں نے کہا، بس تو تم کو استاد کی ضرورت بھی نہیں۔ نقل کرتے کرتے لکھنا آجائے گا۔ ان بی بی نے دل میں میری بات کو تسلیم تو کیا مگر کہنے لگیں، شرم تی آتی ہے۔ تب تو میں نے ان کو خوب آڑے با تھوں لیا کہ دوسروں کے پاس حاجت لے جاتے ہوئے دوسروں کی خوشامد کرتے ہوئے دوسروں پر چبا چبا کراپنے حالات ظاہر کرتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی اور لکھنا سکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کیا لکھنا کچھ نیب بے یا گناہ بے؟ میں نے سا کہ اس کے بعد سے ان بی بی نے اپنا خط کسی سے نہیں لکھا یا اور پھر تو ان کو لکھنے کا ایسا شوق ہوا کہ جن بیویوں کے مرد پر دلیں میں تھے خط لکھنے کو اب ان کے سر ہوتی تھی۔

لکھنے کو لوگوں نے ناقص بدنام کر لکھنے کو مشکل بے مشکل۔ کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن فرض کرو کہ پڑھنے کی نسبت لکھنا کسی قدر مشکل بے بھی تو ویسے ہی اس کے منتفیں بھی ہیں۔ جو شخص پڑھنا جانتا اور لکھنا نہیں جانتا، اس کی مثال اس گونگے کی تی بے جو دوسروں کی سنتا اور اپنی نہیں کہہ سکتا۔ اگر کوئی شخص شروع شروع میں کسی کتاب سے زیادہ نہیں، ایک سطر، دو سطر روز نقل کر لیا کرے اور اسی قدر اپنے دل سے بنائے کرے اور اصلاح لیا کرے اور نقل کرنے اور لکھنے سے جھینپنے اور جھجکنے نہیں تو ضرور چند مہینوں میں لکھنا سیکھ جائے گا۔ خوش خطی سے مطلب نہیں۔ لکھنا ایک بہرہ جو ضرورت کے وقت بہت کام آتا ہے۔ اگر غلط ہو یا حرف بد صورت اور نادرست لکھنے جائیں تو بیدل ہو کر مشق کو موقوف مت کرو۔ کوئی کام ہو، ابتداء میں اچھا نہیں ہوا کرتا۔ اگر کسی بڑے عالم کو ایک ٹوپی کترنے اور سینے کو دو جس کو کبھی اتفاق نہ ہوا ہو وہ ضرور کام ہو، ابتداء میں اچھا نہیں ہوا کرتا۔ چنان پھرنا جو تم کو اب ایسا آسان بے کرے تکلف دوڑی دوڑی پھرتی ہو، تم کو شاید یاد نہ رہا ہو کہ تم نے ٹوپی خراب کرے گا۔ چنان پھرنا جو تم کو اب ایسا آسان بے کرے تکلف دوڑی دوڑی پھرتی ہو، تم کو شاید یاد نہ رہا ہو کہ تم نے کس مشکل سے سیکھا۔ مگر تمہارے ماں باپ اور بزرگوں کو بخوبی یاد بے کرے پہلے تم کو بے سہارے بینھنا نہیں آتا تھا۔ جب تم کو گود سے اتار کر نیچے بٹھاتے، ایک آدمی پکڑے رہتا تھا یا تکیے کا سہارا لگا دیتے تھے۔ پھر تم نے مگر پڑکر گھننوں کے بل چنان سیکھا، پھر کھڑا ہوتا، لیکن چار پائی پکڑ کر۔ پھر جب تمہارے پاؤں مضبوط ہو گئے، رفتہ رفتہ چنان آ گیا۔ مگر صد بامرتہ تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی اور ہر روز تم کو گرتے سن۔ اب وہی تم ہو کر خدا کے فضل سے ماشاء اللہ دوڑی دوڑی پھرتی ہو۔ اسی طرح ایک دن لکھنا بھی آ جائے گا۔ اور فرض کرو کہ تم کو بڑکوں کی طرح اچھا لکھنا نہ بھی آیا، تاہم بقدر ضرورت تو آ جائے گا اور یہ مشکل تو نہ رہے گی کہ دھو بن کے کپڑوں کی دھلانی اور پیسے والی کی پاپیوں کے واسطے دیوار پر لکیریں کھینچتی پھر دیکھ رکھو۔ مگر کا حساب کتنا، لیما دینا، زبانی یا درکھنا بہت مشکل بے اور بعض مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ جو روپیہ پیسہ مگر میں دیا کرتے ہیں، اس کا حساب اپوچھا کرتے ہیں۔ اگر زبانی یا دینیں بے تو مرد کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ روپیہ کہاں خرچ ہوا اور آپس میں ناقص کارنچ و فساد ہوتا ہے۔ اگر عورتیں اتنا لکھنا سیکھ بھی لیا کریں کہ اپنے سمجھنے کے واسطے کافی

ہوتے کیسی اچھی بات نہ۔

لکھنے پڑھنے کے علاوہ سینا پروٹا، کھانا پکانا یہ دونوں ہنر ہر ایک لڑکی کو سیکھنے ضرور ہیں۔ کسی آدمی کو حال معلوم نہیں بنے کہ آئندہ اس کو کیا اتفاق پیش آئے گا۔ بڑے امیر اور بڑے دولت مند یا کیک غریب اور ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہنر ہاتھ میں پڑا ہوتا ہے، ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ اگلے فتوں کے بادشاہ باوجود دولت و ثروت کے ضرور کوئی ہنر سیکھ رکھا کرتے تھے تاکہ مصیبت کے وقت کام آئے۔ یاد رکھو! دنیا میں کوئی حالت قابل اعتبار نہیں۔ اگر تم کو اس وقت آرام فراگت میسر ہے، خدا کا شکر کرو کہ اس نے اپنی مہربانی سے ہمارے گھر میں برکت اور فراگت دی ہے۔ لیکن اس کے معنی نہیں ہیں کہ تم اس آرام کی قدر نہ کرو یا آئندہ کے واسطے اپنا طمیان کرو کہ یہی آرام ہم کو ہمیشہ کے واسطے حاصل رہے گا۔ آرام کے دونوں میں عادتوں کا درست رکھنا ضرور ہے۔ اگرچہ خدا نے تم کو فوکر چاکر بھی دیجے ہوں لیکن تم کو اپنی عادت نہیں بگاڑنی چاہیے۔ شاید خونخواستہ مقدمہ رہ باقی نہ رہے تو یہ عادت بہت تکمیل دے گی۔ آپ اٹھ کر پانی نہ پینا یا چھوٹے چھوٹے کاموں میں نوکروں یا چھوٹے بھائی بھنوں کو تکلیف دینا اور آپ احمد بن کریم نے بھی دیجے رہنا نامناسب اور عادت کے بگاڑنے کی نشان ہے۔ تم کو اپنا کام سب آپ کرنا چاہیے۔ بلکہ اگر تم چست و چالاک رہو تو گھر کے بہت سے کام تم اٹھا سکتی ہو۔ اور اگر تم تھوڑی تھی محنت بھی اختیار کرو تو اپنی ماں کو بہت پچھمد و اور سہارا کا سکتی ہو۔ خوب غور کے کے اپنا کوئی کام ایسا مت چھوڑو جس کو ماں اپنے ہاتھوں کرے یا دوسروں کو اس واسطے باقی اور تکمیل دیتے پھر وہ رات کو جب سونے لگاؤ اپنا بچھوٹا اپنے ہاتھ سے بچھالیا کرو اور صبح سوریے اٹھ کر آپ تہہ کر کے احتیاط سے مناسب جگہ رکھ دیا کرو۔ اپنے کپڑوں کی گلتری اپنے اہتمام میں رکھو۔ جب کپڑے بدلنے ہوں، اپنے ہاتھ سے پھٹا اوہڑا اور ست کر لیا کرو۔ میلے کپڑوں کی احتیاط کرو۔ جب تک دھو بن کپڑے لینے آئے، ان کو غلیجد دکھونی پرانکا رکھو۔ اگر کپڑے بدل کر میلے کپڑے اٹھا کرنے رکھو گی تو شاید چوبے کاٹ ڈالیں یا پڑے پڑے زیادہ میلے ہو جائیں اور دھو بن ان کو خوب صاف نہ کر سکے۔ یا شاید زمین کی نئی اور سیئے کی تری سے ان میں دیکھ لگ جائے۔ پھر دھو بن کو اپنے میلے کپڑے آپ دیکھ کر دیا کرو اور جب دھو کر لائے خود دیکھ لیا۔ شاید کوئی کپڑا کم لائی ہو یا کہیں سے پھاڑنے دیا ہو یا کہیں پرانا باقی نہ ہو رہ گئے ہوں۔ اس طریقہ تم اپنے کپڑوں کی خبر رکھو گی، تمہارے کپڑے خوب صاف دھلا کریں گے اور کوئی کپڑا گم نہ ہو گا۔ جو زیور تھم پسپنے رہتی ہوئی داموں کی چیزیں ہے۔ شام کو ہونے سے پہلے اور صبح کو جب سوکر انھوں خیال کر لیا کرو کہ سب ہیں یا نہیں۔ اکثر بے خبر لڑکیاں سمجھیں کو دیں زیور گردیتی ہیں اور کئی کئی دن کے بعد ان کو معلوم ہوتا ہے کہ باقی اگر گئی، چھلا کنک پڑا۔ کیا معلوم ہے اسی چیز کس کی نظر پڑ گئی اور اس نے اٹھائی یا کہیں منی میں دب دبائی۔ تب وہ غافل لڑکیاں زیور کے

واسطے افسوس کر کے روتی اور تمام گھر کو جتجو میں حیران کر مارتی ہیں۔ اور جب ماں باپ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی زیور کو احتیاط سے نہیں رکھتی اور کھود دیتی بے تقدیم بھی دریغ کرنے لگتے ہیں۔

تم کو ہمیشہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ گھر کے کاموں میں سے کون سا کام تمہارے کرنے کا ہے، بے شک چھوٹے بھائی بھیں اگر روتے اور ضد کرتے ہیں تو تم ان کو سنبھال سکتی ہو تا کہ ماں کو تکلیف نہ دیں۔ منہ دھلانا ان کے کھانے اور پانی کی خبر رکھنا، کپڑا پہنانا، یہ سب کام اگر تم چاہو تو کر سکتی ہو۔ لیکن اگر تم اپنے بھائی بھنوں سے لڑوا اور ضد کرو تو تم خود اپنا وقار کھوئی اور ماں کو تکلیف دیتی ہو۔ وہ گھر کا کام دیکھے یا تمہارے مقدمے کا فیصلہ کیا کرے۔ گھر میں جو کھانا پکتا ہے اس کو اس غرض سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ کب پک چکے گا اور کب ملے گا۔ گھر میں جو کتنا اور ملی یا دوسرے جانور پلے ہیں وہ اگر پیدا بھرنے کی امید سے کھانے کے منتظر ہیں تو مضا نقہ نہیں۔ لیکن تم کو غور کرنا چاہیے کہ ماں کس طرح جھوٹا جاتا ہے، نمک کس انداز میں ڈالتے ہیں۔ اگر ہر ایک کھانے کو غور سے دیکھا کرو تو یقین بے چند روز میں تم پکانا سیکھ جاؤ گی اور تم کو وہ ہنر آجائے گا جو دنیا کے تمام ہنروں میں سب سے زیاد ضرورت کی چیز ہے۔ معمولی کھانوں کے علاوہ تکلف کے چند کھانوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ کباب، پاؤ، ٹیٹھے چاول، زردہ، ٹنجن، چینی، مرہ، فرنی سب مزے دار کھانے ہیں۔ ہر ایک کی ترکیب یاد رکھنی چاہیے۔ بعض کھانے تکلف کے تو نہیں ہوتے لیکن ان کا مزے دار پکانا آنکھیں کی بات ہے۔ جیسے چھلی، کریلے۔ سینا تو چند اس دشوار نہیں، قطع کرنا البتہ عقل کی بات ہے۔ دل لگا کر اس کو معلوم کر لیما بہت ضرور ہے۔ عورتوں کے سب کپڑوں کو قطع کرنا خاص طور پر ضرور سمجھ لیما چاہیے۔ ہم نے اکثر بے وقوف عورتوں کو دیکھا ہے کہ اپنے کپڑے دوسری عورتوں کے پاس قطع کرنے کے لیے بھرا کرتی ہیں اور ان کو تھوڑی تی بات کے لیے بہت سی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ مردانے کپڑوں میں انگر کھا کسی قدر مشکل نہ۔ تم اپنے بھائیوں کے انگر کھے قطع کیا کرو۔ دوچار انگر کے قطع کرنے سے سمجھ میں آ جائے گا۔

قصے کا آغاز اور جن لوگوں کا اس قصے

میں بیان ہے، ان کے مختصر حالات

اب تم کو ایک مرے کا قصہ سناتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ جمالت اور بے بنی سے کیا کیا تکلیفیں پہنچتی ہیں۔

دلی میں اندیش خانیوں کا ایک بڑا مشہور خاندان بہت مت سے اس خاندان کے مردوں کے نام اندیش خان پر چلے آتے ہیں جیسے دور اندیش خان، مآل اندیش خان، خیر اندیش خان وغیرہ۔

اس سے یہ لوگ اندیش خانی کہلائے۔ ان لوگوں کا تابع اخاندان تھا کہ شہر میں شریفوں کا کوئی محلہ نہ ہو گا جس میں دو چار گھر اندیش خانیوں کے نہ ہوں۔ یہ لوگ سب کے سب نوکری پیشہ اور اکثر ہندوستانی سرکاروں میں ممتاز خدمتوں پر مامور رہتے۔

دور اندیش خان ہن کے خاتمی حالات سے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے پنجاب کے پیاری اضلاع میں سرکار انگریزی کی طرف سے تحصیل دار تھے۔ نوکری اور تنخواہ تو کچھ ایسی بہت بڑی نہ تھی مگر آدمی لا اُق، دیانت دار اور کارگزار کا تین صفتیں نوکروں میں کم ہوتی ہیں۔ اس سے انگریزوں میں اچھی آبرو پیدا کی تھی۔ ہم سے اور دور اندیش خان صاحب سے جب اول ملاقات ہوئی کہ اس کو بھی اب چار سو اپار بر س ہونے آئے تو ان کی عمر ایسی کوئی چوالیں پینتا لیں بر س کے قریب رہی ہو گی۔ بہت ہی خوش روآدمی تھے۔ کشیدہ قامت، بدن کے اکبرے، جامہ زیب، داڑھی کچھڑی ہو چال تھی۔ ہم تو تجھے تھے کہ دادا اور نانا ہو گے تو عجب نہیں مگر ایسی بہت اولاد بھی نہ تھی، صرف دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ یہ چاروں بچے گنجائیں جمنی طور پر پیدا ہوئے یعنی سب سے بڑی پہلوٹی کی اکبری، اس کے اوپر خیر اندیش، اوپر اصغری، اصغری کے بعد سب سے چھوٹا مآل اندیش، ایک دن کچھ یوں ہی مذکور آگیا کہ اولاد کم بے تو بولے کہ خدا اصغری کی عمر میں برکت دے اور اس کو صاحب نصیب کرے اور انشاء اللہ ہو گی۔ مجھے تو بیٹا بیٹی کسی کی تمنا باتی نہیں۔

دور اندیش خان نیس بر س اپرے ہو کر اکیسوں میں لگے تھے کہ ان کا بیاد اور اکبری پیدا ہوئی بیاد کے کہیں دس ساڑھے دس بر س بعد۔ ہم صحیح ہیں کہ زیادہ تر اس انتظار کے سبب اور کسی قدر پہلوٹی کی ہونے کی وجہ سے بھی اکبری کے ساتھ ایسے

چونچلے بر تے گئے کہ انہوں نے اکبری کے مزان پر بہت ہی برا اثر کیا۔ نہ تو اس نے کچھ لکھا پڑھا، نہ کوئی ہنر سیکھانا عتمل حاصل کی اور نہ اپنی عادتوں کو سنوارا۔ بس اکبری میں سوائے اس کے کہ دا ایک شریف خاندان کی بیٹی تھی، تعریف کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ پیدا ہونے کے ساتھ اس کو نانی نے اپنی بیٹی بنایا اور اس قدر اس کی ناز برداری کی کہ اس کے رو نے اور مچلنے کے ڈر سے وہ بے چاری کسی کی شادی بیاہ میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ اکبری ماں کو آپ اور باپ کو بھائی کہتی تھی۔ اور کبھی کیا تھی اس طرح پر اس کو سمجھایا اور سمجھایا گیا تھا۔ وہ بات بات پر ماں باپ سے رد و کدر رکھتی کہ گویا، دونوں اوپر تلے کی ہیں۔ ماں کے ساتھ لڑتے جگڑتے دیکھ کر ڈانتے اور دھمکانے کا کیا نہ کوئی انتہی اسی کی جماعت بیٹیں اور گزر گزر کر بیٹی سے کہتیں۔ ”پھر بھائی بچے کی بات کا برائیوں مانو۔“

دوراندیش خال جہاں نوکر ہوتے اکثر بی بی بچوں کو اپنے پاس بالبھی لیا کرتے تھے۔ جب کبھی ایسا اتفاق ہوا نانی نے اکبری کو کسی نہ کسی بھانے سے روک لیا اور جب سے پیدا ہوئی بیاہ کی گھری تک، ایک لمجھ کے لیے اپنے سے جدانہ کیا اور یوں اکبری نانی کے احتمانہ لاڑ کی وجہ سے ماں اور باپ دونوں کی تینیس سے مطلقاً آزاد ہی رہی اور بے سری اٹھی۔ اصغری کا حال اس کے خلاف تھا۔ سارے چونچلے اور ارمان تو اکبری پر ختم ہو چکے تھے یہ اپنی خوش نصیبی سے اپنے ماں باپ کے یہاں تیسری جگہ تھی۔ اس نے پرورش پائی بڑوں کی نگرانی میں۔ بزرگوں کی روک نوک میں اس نے چھوٹی تی عمر میں قرآن مجید کا ترجمہ اور مسائل کی اردو کتابیں پڑھ لی تھیں۔ لکھنے میں بھی عاجز نہ تھی اگر ماں دلی میں ہوتی اور باپ باہر نوکری پر تو جب تک دلی میں رہتی گھر کا حال باپ کو ہر ہفتے کے ہفتے لکھ بھیجا کرتی۔ ہر ایک طرح کا کپڑا اسی سکتی تھی اور انواع و اقسام کے مزے دار کھانے پکانا جانتی تھی۔ تمام محلے میں اصغری خامم کی تعریف تھی۔ ماں کے گھر کا نام بندوبست اصغری خامم کے باتھوں میں تھا۔ جب کبھی باپ رخصت لے کر گھر آتا، خانہ داری کے انتظام میں اصغری سے صلاح پہنچتا۔ روپیہ پیسے کو ٹھڑیوں اور صندوقوں کی کنبیاں سب کچھ اصغری کے اختیار میں رہا کرتا تھا۔ اصغری کی نیک نیتی اور سلیقہ مندی دیکھ کر ماں باپ دونوں دل و جان سے اصغری کو چاہتے بلکہ محلے کے سب لوگ اس کو پیار کرتے تھے۔ مگر اکبری خود بخوبی اپنی بہن سے ناراض رہا کرتی بلکہ اکیا اپا کرما بھی لیا کرتی تھی لیکن اصغری ہمیشہ آپ کا ادب کرتی اور کبھی ماں سے اس کی چغلی نہ کھاتی۔ دونوں بہنوں کی ملنگی اتفاق سے ایک ہی گھر میں ہوتی۔ محمد عاقل اور محمد کامل دو حقیقی بھائی تھے۔ اکبری کا بیاہ بڑے محمد عاقل سے ہوا تھا اور اصغری کی بات محمد کامل کے ساتھ ٹھہر چکی تھی مگر بیاہ نہیں ہوا تھا۔

اکبری کی بد مزاجی اور اس کا سرال سے روٹھ کر چا آنا

کنبے کے لوگوں میں اکبری کی بد مزاجی بے ہنری اور شرارتوں کی اس قدر شہرت تھی کہ جہاں کہیں اس کی منانی کا پیغام جاتا کوئی حامی نہیں بھرتا تھا۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ نہ مگان ایک دم سے مردوں ہی مردوں میں ایک ساتھ دونوں بہنوں کی بات تھبیر گئی۔ حسن اتفاق سے دوراندیش خاں اور مولوی محمد فاضل میں پرانی راہ و رسم تھی۔ دونوں نے ایک استاد سے پڑھا بھی تھا۔ ایک مرتبہ دوراندیش خاں رخصت لے کر دلی میں آ رہے تھے۔ راہ میں مل گئے مولوی محمد فاضل۔ انہوں نے بے اسرار ان کو اپنے پاس تھبیرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اندیش خاں نے اپنی دونوں بیٹیاں مولوی صاحب کو دینی منظور کر لیں۔ جب کنبے والوں کو معلوم ہوا تو کسی نے محمد عاقل کی ماں سے کہا بھی کہ تمہیاں کا کیا پوچھنا بے مگر بڑی بڑی کی کو لوگ مزانت کی بہت تیز بتاتے ہیں۔ محمد عاقل کی ماں اس طرح کی نیک عورت تھی کہ ہر چند اکبری کے حالات سننے اس کو سب معلوم تھے تاہم اس نے یہی جواب دیا کہ استخوان اچھی چاہیے۔ خدار کے امیر گھر کی بیٹی ہے۔ بڑی پھر کر کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ نانی کو تھا ارمان اور ارمان کی جگہ تھی۔ انہوں نے کسی بات میں بچی کے دل کو میلا ہونے نہیں دیا۔ لاڈپیار میں آ کر کچھ ضد کرنے لگی ہو گئی، سو بچے اپنی جگہ بھی ضد کیا کرتے ہیں۔ بیاد کی دیر ہے، آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

مگر یہ صرف بڑی بی کا خیال تھا۔ اکبری بیاہ ہونے سے درست تو کیا ہوتی، س نے چوتھے پانچویں ہی مینے میاں پر تقاضا کرنا شروع کیا کہ تم سے تمباری ماں کے ساتھ نہیں رہا جاتا، ہم یا تو رہیں گے اپنے بیکے میں یا آگرائیں ہی زبردستی بنے تو کسی دوسرے محلے میں چل رہو۔ ہم سے یہ دن رات کی کل کل نہیں آہی جاتی۔ محمد عاقل ہکابکا سا ہو کر منہ دیکھنے لگا اور بولا۔ ”آخڑ کچھ بات بھی ہے؟ مجھ سے تو آن تک اماں جان نے تمباری کوئی شکایت نہیں کی۔“

اکبری: اُوارسنو۔ الٹا چور کو تو اُل کوڑا نئے! وہ میری کیا شکایت کرتیں؟ شکایت کرتا بے کمزور۔ شکایت کرتا بے وہ جس کا کوئی بس نہیں چلتا۔ شکایت کرتا بے مظلوم۔

محمد عاقل: خدا نخواستہ تم پر کسی نے کیا ظلم کیا؟ کچھ بتاؤ گی بھی؟

اکبری: ایک ہوتا تو تاؤ سارے دن ان کو میرا پیٹھتا بے۔

محمد عاقل: تم نے کچھ معلوم بھی کیا کہ کیا چاہتی ہیں؟

اکبری: پاہتی کیا ہیں؟ میرے پاس کسی کے آنے اور بینہنے تک کی روادار نہیں۔ تیوری تو ان کی میں جانتی ہوں، خدا نے چڑھی ہوئی بنائی ہے۔ مگر آن تو انہوں نے چنیا اور زلفن اور رحمت اور سلمتی مند و منہ سب کی فتحتی کی۔

محمد عاقل: تم کو ان لڑکیوں کا کچھ حال بھی معلوم ہے؟ چنیا تو بھیماری ہے، زلفن شاید بخشش قائمی گر کی کوئی بے رحمت سقنوں بے اور اس کا ملکی کلوٹی سلمتی کو میں نے اکثر مولن بخڑے کی دکان پر دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ضرور اس کی بیٹی ہو گی۔ مولن سے اس کا نقشہ بھی ملتا ہوا ہے۔ بھلا بھریہ لوگ اس مقابل ہیں کہ تم ان کو اپنی سہیلیاں بناؤ؟ محلے کے بھلے آدمی سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ غریب ہونا کچھ عیب کی بات نہیں بے مگر ایسے لوگوں کی عادتیں اچھی نہیں ہوتیں، اس خیال سے والدہ نے ان لڑکیوں کے آنے کی ممانعت کی ہو گئی سو یقتو کوئی برآمدتی کی بات نہیں۔

اکبری: بس تم ماں بیٹوں کی مرضی تو مجھے قید میں ڈالنے کی ہے۔ سارے دن اکیلے چپ بیٹھے بیٹھے آدمی کا دم گھٹ جائے نون!

محمد عاقل: اکیلی کیوں جیخو، گلی کی گلی میں قاضی امام علی، حکیم شفاء الدولا، فرشی متاز احمد، مولوی روح اللہ، میر حسن رضا ائمماً آغاً صاحب وغیرہ کوڑیوں اشراف بھرے پڑے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بہوں بیٹوں سے ملوچشم ماروٹن ذلی ماشاد۔

اکبری: ان سے ملے میری جوتی۔ ان سے ملے میری بلا۔ تم بھی وہی ہماری اماں جیسی ہائی لاۓ۔ وہ بھی بہت میرے پیچھے پڑا کرتی تھیں کہ منہیاری کی بیٹی بوسے نہ مل۔ وہ بیٹی ہوئی تھی میری سیلی، بھلا اس سے کیسے نہ ملتی؟ اماں کی ضد میں، میں نے بونے کے ساتھ ایک چھوڑ دو گڑیوں کے بیاد کیے اور اماں سے چہاچہ اکران ان اور پیسے اور کپڑے اور کوڑیاں اتنی چیزیں بونکو دیں کہ اماں بھی رُت ہو گئیں۔ نانی اماں کے ڈر کے مارے مارتیں تو کیا، بہتیرا کوستی تھیں، برآ بھلا کہتی تھیں مگر ہم نے بونے ملننا نہ چھوڑا۔

محمد عاقل نے کہا ”تم نے بہت جمک مارا۔“

یہ سن کرو واحمق عورت بولی ”وکھوا خدا کی قسم! میں نے کہ دیا کہ مجھ سے زبان سنبھال کر بولا کرو۔ نہیں تو پیٹ پیٹ کر اپنا خون کرڈا لوں گی۔“

یہ کہہ کرو درونے لگی اور اپنے ماں باپ کو کوشا شروع کیا: الہی! اس اماں با اکابر اہو، کیسی کم بختی میں مجھ کو دھکیل دیا ہے۔ مجھ کو اکیا پا کر سب نے ستانہ شروع کیا ہے۔ الہی! میں مر جاؤں، میرا جنازہ دلکھے اور غصے کے مارے پان کھانے کی پٹاری جو چار پائی پر رکھی تھی لات مار کر گردادی۔ تمام کھانا چونا تو شک پر گرا۔ اونی دریں کالخاف پائعتی تہہ کیا ہوا کھانہ۔ چونے کے لگتے ہی اس کا تمام رنگ کٹ گیا۔ پٹاری کے گرنے کے نسل سن کر سامنے کے والا ان سے ساس دوڑی آئیں۔ ماں کو

آتے دیکھ کر بیٹا تو دوسرے دروازے سے چل دیا لیکن اپنے دل میں کہتا تھا، نحق میں نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑا۔ ساس نے آ کر دیکھا تو چار پیسے کا کھانا جو کلیں چھان پکا کر کھہیا میں بھر دیا تھا، سب گر پڑا۔ تو شگ کھتے میں لٹ پت بے آتے ہی ساس نے بھوکو گلے سے لگالیا اور اپنے بیٹے کو ناحق بہت کچھ برائی کیا۔ اتنی دل جوئی کا سہارا اونگستے کو ٹھیکتے کا بہانہ ہوا۔ ہر چند ساس نے منت کی اور سمجھایا، اس مکار عورت پر مطلق اثر نہ ہوا۔ نمسائے کی عورت میں رون پیشے کی آواز سن کر جمع ہو گئیں۔ یہاں تک نوبت پہنچی کے بخشوش قاعی گر کی بیٹی زلفن سہر صیانے دوڑی گئی اور ایک ایک کی چار چار لگانگیں۔ تانی کی بے تمدیر یہیں نے تو اکبری کو نمارت ہی کیا تھا نہ اچھی طرح پوچھا نہ چھما، سنتے کے ساتھ ڈولی پر چڑھا آپنی پیشیں، بہت کچھ لڑیں جگڑیں، آخر اکبری کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

اکبری کی شرارتیں، پھوہڑپن، حمق اور بد مزا جیاں
اس کا پھر عین عید کے دن بے لطفی سے چلا جانا،
شبناً اصغری کی مدح

اکبری گئی تو ایسی بے طوری تھی کہ شاید اس کو رسول سرال کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر اتفاق سے اس کی سگنی خالہ محمد عاقل کے گھر کے قریب رہتی تھیں۔ اگر یہ نیک بخت تو تھیں نہ کرتیں تو سرال میں اکبری کی ایک دن بھی گزرنہ ہوتی۔ اکبری کا چلا جانا سن کر خالہ نے بہت فسوس کیا کہ اگر مجھ کو وقت پر ذرا بھی لڑائی کی خبر ہوتی تو اکبری کی ایسی کیا مجال تھی کہ چل جاتی۔ میں تو اس کوڈولی میں سے گھیٹ لیتی۔ انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ اکبری تو نزی احمدی تھی۔ رہیں تانی، ان کو خدا نے بیٹھے بھائے نواتی کا عشق لگا دیا ہے۔ مگر باں آپ (اکبری کی ماں) بیٹی کو بھانے والی نہیں۔ جب دیکھا کہ بہت دن ہو گئے اور جانہیں سے سلام و پیام تک متروک بنے تو بھائی کی مانتا کی ماری خود گئیں اور ماں اور تانی دونوں کے سامنے اکبری کو بہت کچھ اعتمت ملامت کی، سمجھایا، دھرم کیا، ڈرایا اور اپنی ماں سے کہا کہ تمہاری بادولی محبت اس کو ضرور گھر سے اجاڑ کر رب گی۔ بارے رمضان کی تقریب سے زبردستی بھائی کو سرال اواہ نہیں کہ سعد من اکیلی ہیں۔ اوپر سے آرہا بے رمضان۔ غصے کو تھوک ڈالا اور چل کر ساس کا با تھہ بناو۔ اب تم پنج نہیں رہیں۔ تمہاری عمر بال بچھونے کی بے۔ بھاری بھر کم: ہوا اور گھر کو گھر سمجھو۔ لڑو یا جنگلڑو تم کو اپنی عمر اسی گھر میں بسر کرنی بے۔

چند روز تک محمد عاقل مزان دار بہو سے ناخوش رہا۔ آخر کو خیال ساس نے میاں بی بی کا ملاپ کر دیا لیکن مزاجوں میں جب ناموافقت ہوتی بے توہرا ایک بات میں بگاڑ کا سامان موجو ہوتا بے۔ محمد عاقل نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آنے میں نے دوست کی دعوت کی بے۔ افظاری اور کھانے کا اب تمام زیادہ ہوتا جائیے۔ ماں نے جواب دیا۔ ”تین دن سے افظار کے وقت مجھ کو لرزد چڑھتا بے۔ مجھ کو اپنی خبر تک نہیں رہتی۔ خدا ہمسائی کا بھلا کرے کروہ بے چاری آ کر پکا جاتی بے۔ تم نے دعوت سے پہلے گھر میں پوچھلو لیا ہوتا۔“

محمد عاقل نے بی بی کی طرف اشارہ کر کے کہا ”یہ کیا اتنے کام کی بھی نہیں ہیں؟“ بہو کو اتنا خبط کہاں تھا کہ اتنی بات سن کر چپ رہے۔ سنتے ہی بولی ”اپنی ماں سے پوچھو کہ بیٹے کا بیاہ کیا بے یا اونڈی مول لی بے؟ اوصاح بے روزے میں چو لبا

جموں کننا!“

محمد عاقل نے سوچا، اب اگر میں کچھ روکد کرتا ہوں تو پبلے کی طرح رسوائی ہو گی۔ اپنا سامنہ لے کر رو گیا اور انتظار کے واسطے بازار سے کچھ مول لے آیا۔ غرض بات تمل گئی۔

اب محمد عاقل کو دوسری آفت پیش آئی۔ عید سے بے چارے نے ایک ہفتہ آگے مزان دار بہو صاحب کے جوڑے کی تیاری شروع کی۔ ہر روز طرح طرح کے کپڑے، رنگ برنگ کی چوڑیاں، ڈیڑھ حاشیہ اور سلمہ ستارے کی کامدار جوتیاں لاتا۔ مزان دار کی خاطر تلے کچھ نہیں آتا اور پھر کم بخت اپنے منہ سے بچوٹی بھی نہ تھی کہ ایسی چیز لا دو۔ یہاں تک کہ عید کا ایک دن باقی رہ گیا۔ مجبور ہو کر اکبری خانم کی خانی کے پاس گیا۔ انہوں نے آوازن کر اندر بایا۔ بالائیں لیں، پیارے بھائیا اور پوچھا ”کہوا کبری خانم تو اچھی بے؟“

محمد عاقل نے کہا ”صاحب آپ کی بھانجی تو عجیب مزان کی عورت ہیں۔ میرا تو دم ناک میں آ گیا۔ جو ادب سوزانی بے اور جوبات بے سو ٹیڑھی۔“

خیال ساس نے کہا ”بیٹا اس کا کچھ خیال مت کرو۔ ابھی کم عمر بے بال بچے ہوں گے، گھر کا بوجھ پڑے گا، مزان خود بخود درست ہو جائے گا اور آخر اچھے لوگ بروں سے بھی نباہ دیتے ہیں۔ بیٹا تم کو خدا نے سب لائق کیا ہے، ایسی بات نہ ہو کہ لوگ نہیں آ ختمہماری ناموں بے۔“

محمد عاقل نے کہا ”جناب میں تو خود اتنی خیال سے درگزر کرتا رہتا ہوں۔ اب یکچھی کل عید بے۔ اس وقت تک نہ چوڑیاں پہنچیں ہیں نہ کپڑے بنائے ہیں۔ ذرا آپ چال کر سمجھا دیجئے۔ میں نے بہت کچھ کہا، اماں نے بہت کچھ نہیں کیں، نہیں مانتیں۔“

خیال ساس نے کہا ”اچھا تمہارے خواہا بانماز پڑھنے مسجد میں گئے ہیں، آ لیں تو ان سے پوچھ کر چلتی ہوں۔“ غرض خالہ اماں نے جا کر چوڑیاں پہنچانیں، کپڑے قطع کیے، جلدی کے واسطے سب مل کر سینے پہنچیں۔ خالہ نے کہا ”میں پا جائے میں کلیاں تم لگاؤ، گوٹ تمبہاری ساس کتریں، میں تمبہارے دو پٹے میں توئی نالگتی ہوں۔“

جب اکبری کلیاں لگا چکی تو اس نے اتر اکر خالہ سے کہا ”او بھئی تمبہارے ابھی دو پٹے باقی ہیں اور میں دونوں پانچوں میں کلیاں لگا بھی چکی۔“

خالہ نے دیکھا تو سب کلیاں اٹھی۔ اکبری کی ساس کے لحاظ سے منہ پر تو کچھ نہ کہا لیکن چپکے چپکے دو چار پنچکیاں ایسی لیں کہ اکبری کی آنکھوں میں آنسو بھرائے اور اشارے سے کہا دیوں بچوٹی، سو جھ تو۔ اٹھ کلیاں لگا کر پہنچی بے۔ اکبری نے

اپنے سیاہوا سب ادھیر اور پھر کمایاں لگانی شروع کیں۔ جب لگا چکی تو خالہ نے پھر دیکھا تو سب میں جھوٹ۔ اب تو خالہ سے نہ رہا گیا اور اکبری کی ساس کی آنکھ بجا کر ایک سوئی اکبری کے باتحہ میں چھوڑ دی اور کمایاں پھر ادھیر کر آپ لگائیں۔ غرض خدا خدا اکر کے مزان دار بہو کا جزو اسل کرتیا رہا۔ اکبری کی خالہ اپنے گھر کو رخصت ہوئیں۔

اگلے دن بچے عید کی خوشی میں سوریرے سے جا گے۔ کسی نے رات کی مہندی گھولی۔ کسی نے کھلی اور شین کے لیے غل چھایا۔ کسی نے اٹھنے کے ساتھ ہی عیدی مانگنی شروع کی، محمد عاقل بھی نماز صبح سے فارغ ہو کر حمام میں غسل کرنے چاگیا۔ نہایہ دھو کر چار گھنٹی دن چڑھے واپس آیا۔ لٹکوں کو دیکھا کہ کپڑے بدلا عید کے واسطے تیار ہیں لیکن مزان دار بہو صاحب حسب عادت پڑی سورہی ہیں۔ محمد عاقل نے اپنی چھوٹی بہن محمودہ سے کہا ”محمودہ اپنی بھانی کو جگا دو۔“

پہلے تو محمودہ نے تامل کیا، اس واسطے کے یہ مزان دار بہو سے بہت ڈرتی تھی۔ جب سے بیاہ ہوا مزان دار نے ایک دن بھی اپنی چھوٹی نند کے ساتھ محبت سے بات نہیں کی تھی اور نہ کبھی اس کو اپنے پاس آنے اور بینہنے دیا تھا۔ لیکن بھانی کے کہنے سے عید کی خوشی میں محمودہ دوڑی چل گئی اور کہا ”بھانی انھوں“ بھانی نے اٹھنے کے ساتھ محمودہ کے ایک طمانچہ رسید کیا۔ محمودہ رو نے لگی۔ باہر سے بھانی آواز سن کر دوڑا اس کو روتا دیجئے کر گود میں اٹھایا اور پوچھا ”کیا ہوا؟“

محمودہ نے رو تے رو تے کہا ”بھانی جان نے مارا۔“

مزان دار نے کہا ”دیکھو چھوٹی نامرا د۔ آپ تو دوڑتے ہیں گری اور میرا نام لگاتی ہے۔“

محمد عاقل کو غصہ تو بہت آیا لیکن مصلحت وقت سمجھ کر ضبط کیا۔ محمودہ کو پیار چکار کر چپ کیا اور بی بی سے کہا ”خیر انھوں نہادو،“ کپڑے بدلو۔ دن چڑھ گیا بنے۔ میں عید گاہ جاتا ہوں۔“

مزان دار نے تاک بھوں چڑھا کر کہا۔ ”میں نے ایسے سوریرے نہیں نہاتی۔ سردی کا وقت ہے۔ تم اپنی عید گاہ جاؤ میں نے کیا پا پکڑ رکھا ہے۔“

محمد عاقل کو ایسی روکھی بات سن کر بہت افسوس ہوا اور مزان دار سدا کی ایسی کم بخت تھی کہ بیشہ اپنے میاں کو تا خوش رکھتی تھی۔ اتنے میں محمد عاقل کی ماں نے پکارا کہ بیٹا، جاؤ، بازار سے دودھ لائے تو خیر سے عید گاہ سدھارو۔

محمد عاقل نے کہا ”بہت خوب۔ پیسے دیجئے۔ میں دودھ لائے دیتا ہوں۔ لیکن اگر میرے واپس آنے تک انہوں نے کپڑے نہ بدلتے تو سب کپڑے چوپ لے میں رکھ دوں گا۔“

محمد عاقل تو دودھ لینے بازار گیا، ماں کو معلوم تھا کہ لڑکے کام مزان بہت برہم بے اور طبیعت بھی اس طرح کی واقع ہوئی۔ بے کا اول تو اس کو غصہ نہیں آتا اور جو کبھی آتا ہے تو اس کی عقل ملکانے نہیں رہتی۔ ایسا نہ ہو سچ مجھ نے کپڑے جادے۔

جلدی سے بہو کے پاس آئیں اور کہا۔

”بیٹی خدا کے لیے برس کے برس دن تو بدشگونی مت کرو۔ انہوں نہاد، کپڑے بدلو۔“

مزانِ دار نے کہا ”نہیں بی، میں تو اس وقت نہیں نہاتی۔ تھبہ کر نہیں لوں گی۔“

بارے ساس نے منت سماجت کر کے بہو کو نہلا دھلا کر لگکھی چوتھی کڑ کپڑے پہنا محمد عاقل کے آنے سے پہلے دہن بنا کر بٹھا دیا۔ محمد عاقل یہ دیکھ کر خوش ہوا۔ عیدِ گاہ چلتے ہوئے محمودہ سے پوچھا ”کہو بی تمہارے لیے بازار سے کون سا حکومتی لا نہیں؟“

محمودہ نے کہا ”اچھی خوب صورت تی رحل لادینا۔ اس پر ہم تی پارہ رکھیں گے اور قلم دوات رکھنے کے لیے ایک نئی تی صندوقچی۔“

مزانِ دار خود بخوبی ”اور ہمارے لیے؟“

محمد عاقل نے کہا ”جنت فرمائش کرو۔ یہاں آؤ۔“

مزانِ دار نے کہا ”بھٹے اور سنگھاڑے اور جھٹپیری کے بیڑا اور مزرا کی پھلیاں اور ڈھیر ساری نارنگیاں ایک ڈالی، ایک خبیری۔“

یہ سن کر محمد عاقل ہنسنے لگا اور کہا ”ڈالی اور خبیری کا کیا کرو گی؟“

مزانِ دارِ حق نے جواب دیا ”بجا نہیں گے اور کیا کریں گے؟“

محمد عاقل سمجھا کہ ابھی تک اس بے وقوف میں بے تیز بچوں کی طرح کھانے اور کھیلنے کے پست خیالات موجود ہیں۔ کپڑے بد لئے سے جو خوشی محمد عاقل کو ہوئی تھی، سب خاک میں مل گئی اور اسی افسردگی کی حالت میں عیدِ گاہ چاگیا۔ اس کا جانا تھا کہ مزانِ دار نے ایک اور نئی بات کی۔ ساس سے کہا ”ہم کو ڈولی منگا دو۔ ہم اپنی ماں کے گھر جائیں گے۔“

ساس نے کہا ”بھلا یہ جانے کا کیا موت ہے؟ پھر مہینے کے بعد تو تم ماں کے گھر سے اب آئی ہو۔ میں عید کے دن جانا، بالکل نامناسب ہے۔“

مزانِ دار نے کہا ”میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ دل اٹا چا آتا ہے۔ مجھ کو اپنے میکے کی سہیلی باسو منہیار کی بیٹی بخوبی بہت یاد آتی ہے۔“

ساس نے کہا ”بیٹی نوتن! کسی کو کسی سے ایسا عشق ہو جیسا کہ نوکا بے۔ اگر ایسا ہی دل چاہتا ہے تو اسی کو بابھیجو۔“

مزانِ دار نے کہا ”واہ بڑی بے چاری بانے والی۔ ایسا ہی بانا تھا تو کل اس کو بلو آکر چوڑیاں پہنوانی ہوتیں۔“

ساس نے کہا ”بیٹی مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یہا کیک تم کواس کی یاد گدگدائے گی۔“

مزانِ دار نے کہا ”خیر بی بحث سے کیا نامدہ؟ ڈولی منگوادو، نہیں تو میں بو اسلامتی کے باب سے منگوادیجبوں۔“

ساس نے کہا ”ٹرکی تیری کوئی عاقل ماری گئی بے؟ میاں سے پوچھا نہیں، گچھا نہیں، آپ ہی آپ چلیں۔ اور مجھ کو تو اپنا بدھا چوڑا نہیں منڈوانا بے جوڑ کے کے بے اجازت ڈولی منگوادوں۔“

مزانِ دار نے کہا ”کیا میاں اور کیسا پوچھنا؟ آپ کوئی اپنے ماں باپ سے عید بقر عید کو بھی نہ ملا کرے؟“ اتنا کہہ کر موں کھڑے سے ڈولی منگوادی یہ جاودہ جا۔

تحوزی دیر بعد محمد عاقل عید گاہ سے اونا اور گھر گھستے ہی پکارا ”اویں اپنی خبری اور ڈفائی اوبجاو۔“

دیکھاتو سب چپ ہیں۔ ماں سے پوچھا ”کیا ہوا؟ خیر تو بے؟“

محمودہ نے کہا ”بھائی جان چال گئیں۔“

محمد عاقل نے حیران ہو کر پوچھا ”ایں، کیوں کر گئیں؟ کہاں گئیں؟ کیوں جانے دیا؟“

ماں نے جواب دیا ”میٹھے بھائے یہا کیک کہنے لگیں، میں تو اپنی اماں کے باب جاؤں گی۔ میں نے ہر چند منع کیا، ایک نہ مانی۔ مولیں سے ڈولی منگوادی چال گئیں۔ میں روکتی رہ گئی۔“

محمد عاقل یہ سن کر غصے کے مارے تھرا اٹھا اور چاہا کہ سرال جا کر اس نا بکار عورت کو سزا دے۔ یہ سوت کر باہر نکلا۔ ماں سمجھ گئی۔ جاتے کو پکارا۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ ماں نے کہا ”شabaش! بیٹا شabaش! میں تم کو پکار رہی ہوں اور تم سنتے ہو جواب نہیں دیتے۔ تیرھویں صدی میں ماں کا یہی وقر رہ گیا بے؟“ یہ سنتے ہی محمد عاقل اٹھے پاؤں پاؤں پھرا۔ ماں کہا ”بیٹا یہ تو بتا، اس دھوپ میں کہاں جاتا ہے۔ اب پھر باہر چا۔ ماں صدت گئی۔ جی زندہ ہو جائے گا۔“

محمد عاقل نے کہا ”بے میں کہیں نہیں جاتا۔ مسجد میں حافظ جی سے ملنے جاتا ہوں۔“

ماں نے کہا ”ٹرکے ہوش میں آ۔ میں نے دھوپ میں اپنا چوڑا اسفید نہیں کیا۔ اوسا صاحب، بھیں سے باقی بنانے چا بے حافظ جی کے پاس جاتا ہے تو انگر کھا اور دو پڑا تار کر کھجا۔“

یہ سن کر محمد عاقل مسکرا نے لگا۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس جانماز پر بھالیا اور اس کے سر کی طرف دیکھ کے بولی ”عید گاڈ آ نے جانے میں تمہارے بال تمام گرد آ لو د ہو گئے ہیں۔ ذرا تکیے پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ تو میں صاف کر دوں۔“

محمد عاقل مان کے کہنے سے ذرا کے ذریثے گیا محمود و بھائی کو لینا دیجئے کہ پنچھا جھلنے لگی کچھ تو عید گاہ آنے جانے کی تکان اور اس پنچھے کی شنڈی ہوا اور مان نے بودست شفقت سر پر پھیرا تو سب سے زیادہ اس کی راحت۔ غرض محمد عاقل سو گیا۔ جا گا تو دن ڈھل پکا تھا اور وہ غصہ بھی دھیما ہو گیا تھا۔

مان نے کہا ”لو با تھم نہ دھوو۔ وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھو۔ وقت تنگ ہے۔ پھر آؤ تو تم کو کام بتائیں۔“
نماز پڑھ کر محمد عاقل آیا تو مان نے کہا ”اوسرال جاؤ اور تجھے میری جان کی قسم ب جتو وہاں کچھ لڑایا بولا۔“
محمد عاقل نے کہا ”تو مجھ کو مت سمجھو۔“

مان نے کہا ”لو کے خیر منا۔ الہی کسی ری زبان بے۔ سرال تو تیری اور سمجھوں کسی اور کو۔ اؤیہ ایک روپیہ تو اپنی سالی اصغری کے ہاتھ میں عیدی کا دینا اور یہ ایک اٹھنی اپنی خیال ساس کے بیٹے میاں مسلم کو اور آدھے کھلو نے بھی لیتے جاؤ۔ ایک خوان میں سویا اور دو دھا اور مٹھائی کی ٹوکری بھی ما عظمت کے ہاتھ اپنے ہاتھ لے جاؤ۔ دیکھو، خبردار کچھ بولنا مت۔“
محمد عاقل نے کہا ”اور مال خبری اور ڈھلی بھی لیتا جاؤں؟“
مان نے کہا ”کہیں ایسی بات وہاں مت بول اٹھنا۔“

غرض محمد عاقل ساس کے گھر پہنچے۔ گھر میں اکبری خانم اپنی سہیلیوں کے ساتھ اوڈھم مچاری ہی تھیں اور باہر گلی میں تمام غل کی آواز چلی آتی تھی۔ ما عظمت اندر گئی۔ اصغری نے ماما کو دور سے دیکھ کر دبی آواز سے کہا ”اے بی آپا، اے بی آپا، چپ کرو۔ تمہاری سرال سے ماما آئی ہے۔“ عظمت نے اندر پہنچ کر محمد عاقل کو بلایا ”صاحبزادے آئیے۔“ غرض محمد عاقل اندر گئے۔ ساس کو سلام کیا۔ انہوں نے کہا ”جیتے رہو عمر دراز ہو۔“ اتنے میں اصغری بھی اپنی اور اٹھنی سنبھال سنہوں کو پھری سے نکلیں اور نہایت ادب سے جھک کر بہنوئی کو سلام کیا۔ اصغری کو بہنوئی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے برادر بٹھالیا اور روپیہ دیا۔ اصغری مال کی طرف دیکھنے لگی۔ مان نے کہا ”کیا ہوا؟ لے لو۔ عیدی کا بے۔“ اصغری نے روپیہ لے کر پھر سلام کیا اور ادب سے ذرا پرے کو سرک کر ہو نہیں۔ پھر اٹھ کر نہایت سلیقے کے ساتھ اجا دستر خوان بہنوئی کے آگے لا بچایا اور ایک رکابی میں سویاں ایک پیالے میں دو دھنٹشتری میں قند اور ایک چچپہ لا کر سامنے رکھ دیا۔

ساس نے کہا ”بیٹا کھاؤ۔“

محمد عاقل نے غذر کیا کیا مجھ کو عید گاہ میں زیادہ دیر ہو گئی، بھی تھوڑی دیر ہوئی، میں نے کھانا کھایا ہے۔
ساس نے کہا ”کیا مضا لقہ ہے۔ سویاں تو پانی ہوتی ہیں۔ کھاؤ بھی۔“

جب تک محمد عاقل سویاں کھاتا رہا، اصغری لا چھی ڈال ایک مزے دار پان بنانا آئی۔ کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں

ہوتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد محمد عاقل نے کہا ”جناب“ میں رخصت چاہتا ہوں۔“

ساس نے کہا ”اب کہاں جاؤ گے؟ سیمیں سورہنا۔“

محمد عاقل: آنے عید کا دن بے۔ آئے گئے سے ملنا بے۔ دوسرا کے کہیں کچھ بھیجنے بھجوانا بھی بے اور امیں اماں سے رات کے واسطے کہہ بھی نہیں آیا۔“

ساس: مانے کا تواب وقت نہیں۔ شام ہونے کو آئی۔ اور سبھی بنے بھجوانے کو مدد حسن کافی ہیں۔ (ہنس کر) تم کچھ سعد حسن کا دودھ نہیں پیتے۔ آخر غرضت جائے گی، خبر کر دے گی۔

غرض محمد عاقل نے کچھ حیلے کیئے ساس نے ایک نہ مانی اور محمد عاقل کو زبردستی رہنا پڑا۔ چار گھنٹی رات گئے جب کھانے پینے سے فارغ ہوئے، اصغری نے برتن بھانڈا، اگری پڑی چیز سب مٹھکانے سے رکھی۔ باہر کے دروازے کی زنجیر بند کی۔ کوٹھڑیوں کو قفل لگا کر کنبیاں ماں کے حوالے کیں۔ باہر کے دالان اور باوار پی خانے کا چپان گل کیا۔ ماں اور آپ اور بہنوئی سب کو پان بنانے کر دیئے اور اطمینان سے جا کر سورہ ہی۔

الگ گھر کرنے پر ساس (اکبری کی ماں)

اور داماد (محمد عاقل) کا مباحثہ

اب ساس نے محمد عاقل سے کہا ”کیوں بیٹا، تم میاں بی بی میں کیا آئے دن کی لڑائی رہا کرتی ہے؟ اکبری کی تو ایسی بری عادت ہے کہ کبھی جھول کر بھی سرال کی بات منہ سے نہیں کہتی۔ نہیں تو دنیا جہان کی بنیوں کا دستور ہوتا ہے کہ سرال کی ذرا ذرا رسی بات ماؤں سے لگایا کرتی ہیں۔ نہیں معلوم اس کو کیا خدا کی سنوار ہے۔ بتیرا پوچھ پوچھ کر اپنا منہ تھکاؤ، حاشا کہ یہ پوچھ بھی بتائے۔ لیکن نو لے محلے کی بات کا نوں کان پتھر جاتی ہے اور پری ا لوگوں سے میں بھی گھر بیٹھنے کرنے کرتی ہوں۔“

محمد عاقل نے ساس سے یہ بات سن کر تھوڑی دیر تامل کیا۔ لحاظ کے سبب جواب منہ سے نہیں لکھتا تھا۔ مگر اس نے خیال کیا کہ مدت کے بعد ایسا اتفاق ہوا ہے اور خود انہوں نے چھیڑ کر پوچھا ہے۔ ایسے موقع پر سکوت کرنا سر اسر خلاف مصلحت ہے۔ بہتر ہے کہ عمر بھر کا زہر اگل ڈالے۔ شاید آتن کی گفتگو میں آندہ کے واسطے کوئی بات نہیں آئے۔

غرض محمد عاقل نے شرماتے شرماتے شرماتے کہا ”آپ کی صاحب زادی موجود ہیں۔ ان ہی سے پوچھئے۔ ہمارے یہاں ان کو کیا تکلیف پہنچی؟ خاطرداری و مدارت میں کسی طرح کی کمی ہوئی یا ان سے کوئی لڑایا کسی نے ان کو برآ کہا؟ آپ کو معلوم ہے گھر میں ہم گنتی کے آدمی ہیں۔ والدہ سے تمام محل و اتفق ہے۔ ایسی نیک مزان اور صلح کل ہیں کہ تمام عمر ان کو کسی سے لڑنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر کوئی ان کو دس با تین سخت کبر بھی جائے تو چپ رہ جاتی ہیں۔ محمد کامل دن بھر لکھنے پڑھنے میں رہتا ہے۔ صحیح کا انکار اس کو گھر آتا ہے۔ کھانا کھایا اور سوربا میں نے اس کو ان سے کبھی بات کرتے بھی نہیں دیکھا۔ محمودہ ان کی صورت سے ڈرتی ہے۔ رہا میں تو موجود بھی ہوں جو شکایت ہو، مجھ سے بے تکلف بیان کریں۔“

محمد عاقل کی ساس اب بیٹی کی طرف مخاطب ہو کر بولیں ”باں بھائی جو کچھ تمہارے دل میں ہو، تم بھی صاف صاف کہہ گزر و بات کا دل میں رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ دل میں رکھنے سے رنج بڑھتا اور فساد زیادہ ہوتا ہے۔“

اکبری اگرچہ جھوٹ بولنے پر بہت دلیر تھی لیکن اس وقت محمد عاقل کے رو برو بات کہتے ہیں نہ پڑی۔ جی ہی جی میں ڈر رہی تھی کہ میں نے بہت تی جھوٹ جھوٹ باتیں ماں سے آ کر لگائی ہیں۔ ایمانہ ہو کہیں اس وقت قلعی کھل جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اس بات کو ہی ہال دیا اور کہا کہ ہم تو الگ گھر کریں گے۔

اکبری کی ماں نے داماد سے کہا ”کیوں بھائی، تم کو الگ رہنے میں کیا عذر رہے؟ خدا کا فضل بے، خود نوکر ہو، خود کماتے ہو، کسی بات میں ماں کے محتاج نہیں، اپنا کھانا، اپنا پہنچنا پھر دوسرا سے کا دست نگر ہو کر رہنے سے کیا فائدہ؟ بیٹا بھوکیتے ہی پیارے ہوں پھر بھی جو آرام الگ رہنے میں بے ماں باپ کے گھر کہاں۔ جو چاہا سو کھایا جو چاہا سو پکایا اور غور کرنے کی بات بے ماں باپ کے ساتھ رہ کر لا کہ کہا و پھر بھی نام نہیں۔ اوگ کیا جا نہیں تم اپنا کھاتے ہو یا ماں باپ کے سر پڑے ہو۔“

محمد عاقل نے کہا ”آرام پوچھئے تو ہم کو جواب حاصل بے الگ ہوئے پیچھے اس کی قد ر معلوم ہو گی۔ دونوں وقت پکی پکائی کھانی اور بے فکر ہو کر بیٹھ رہے۔ الگ ہونے پر آتا، دال، گوشت، تر کاری، تیل، نمک، ایندھن سبھی کافر کرنا پڑے گا اور آپ ہی انصاف سے فرمائیے خانہ داری میں کتنے بکھیرے ہیں۔ بے سب ان آنٹوں کو اپنے سر لیما میرے نزدیک تو عقل کی بات نہیں۔ رہایہ کے جو چاہا سو کھایا اور جو چاہا سو پکایا، تو یہ اب بھی حاصل بے ان ہی سے پوچھئے کبھی کوئی فرمانش کی بے جس کی تعقیل نہ ہوئی ہو؟ بڑے کنبوں میں البتہ اس طرح کی تکلیف ہوا کرتی ہے۔ ایک دل ٹیٹھے چاول کو چاہتا ہے، دوسروں کو بھولنی کچھڑی چاہتے، تیسرے کو پاڈور کارب، چوتھے کو رہہ کھانا منظور بے پانچویں کو پرہیزی کھانا حکیم نے بتایا ہے۔ دس کے واسطے دس ہنڈیاں روز کے روز کہاں سے آئیں؟ ہمارے یہاں کنبہ کون سا بہت بڑا ہے۔ فرمانش کریں تو ہم نہ کریں تو ہم۔ اس کو بھی جانے دیجئے۔ اگر ان کو ایسا ہی لحاظ بے تو آپ کھانے کا انتظام کیا کریں۔ خود والدہ کی مرتبہ کبھی چکی ہیں۔ ان ہی سے پوچھئے کہاں بے یا نہیں؟ اور تام کو جو آپ نے فرمایا تو یہ میرے نزدیک مخفی خیال خام ہے۔ اپنے آرام سے کام بے اوگ جو چاہیں سو سمجھیں۔ اور فرض کیجئے اوگوں نے یہی جاتا کہ ہم ماں باپ کے سر ہیں تو اس میں ہماری کیا بے عزتی ہے؟ ماں باپ ہیں، کوئی غیر تو نہیں ماں باپ نے ہم کو پالا اپرورش کیا، کھایا، پہنایا، پڑھایا، لکھایا، شادی بیاہ کیا۔ ان سب باتوں میں بے عزتی نہیں ہوئی تو اب کون سا سرخاب کا پر ہم میں لگ گیا ہے کہ ان کا دست نگر ہونا ہماری بے عزتی کا موجب سمجھا جائے؟“

ساس نے جواب دیا ”اگر سب تمہاری طرح سمجھا کریں تو کیوں الگ ہوں؟ دنیا کا دستور بے، ہوتی چلی آتی ہے اور ہوتی چلی جائے گی کہ بیٹھے ماں باپ سے جدا ہو جاتے ہیں اور میں تو جانتی ہوں دنیا میں کوئی بہوایک نہ ہو گی جس کا میاں کما و اور وہ ساس نندوں میں رہنا پسند کرے۔“

محمد عاقل نے کہا ”یا آپ کافر مانا درست ہے۔ اگر بیٹھے ماں باپ سے جدا ہو اکرتے تو شہر میں اتنے گھر کہاں سے آتے۔ لیکن ہر ایک کی حالت جداب۔ الگ ہو کر رہنا میری حالت کے لیے ہرگز مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ دس روپے کا تو میں نوکر۔ اتنی آمد نی میں الگ گھر کا سنبھالنا نہایت مشکل نظر آتا ہے اور پھر اس نوکری کا بھی اعتبار نہیں۔ خدا نہ است الگ۔

ہوئے پیچھے نوکری جاتی رہی تو پھر باپ کے گھر آنا مجھ پر نہایت شاق ہو گا۔ اس وقت البتہ بے عزتی ہو گی کہ میاں الگ تو ہو گئے تھے پھر جبک مارکر باپ کے ٹکڑوں پر آپڑے۔ لوگوں کی ریس اس معاملے میں ٹھیک نہیں۔ آدمی کو اپنے حال پر نظر کرنی چاہیے۔ وہ نقل آپ نے سنی ہے کہ ایک شخص نے بازار سے نمک اور روئی مول لی۔ نمک خچر پر لا دا اور روئی گدھے پر۔ راہ میں ایک ندی واقع ہوئی۔ ندی تھی پایا۔ اس شخص نے خچر اور گدھے دو نوں کو لدالدیا پانی میں اتار دیا۔ تھی ندی میں پہنچ کر خچر نے غوطہ لگایا۔ تھوڑی دیر بعد سرا بھار اتو گدھے نے پوچھا ”کیوں یا، خچر یہ تم نے کیا کیا؟“ خچر نے جواب دیا ”بھائی، تم بڑے خوش قسمت ہو۔ تم پر لدی بے روئی۔ اس کا ابو جھبے ہلکا۔ مجھ کم جنت پر بے نمک۔ ابو جھبے کے مارے میری کمر کر کر لہو لہان ہو گئی ہے۔ یہ ہمارا ماں اک ایسا بے رحم ہے کہ اس کو مطلق ہماری تکالیف کا خیال نہیں۔ اتا پ شناپ جتنا چاہتے ادا دیتا ہے۔ میں نے سمجھا کہ منزل تک پہنچنے پہنچنے کرنے والے بے روئی۔ آؤ غوطہ لگاؤ۔ نمک پانی میں بھیگ کر کچھ تو گھل جائے گا۔ جس قدر بلکہ ہوئے غنیمت۔ ماں بہت کرے چھ سات ڈنڈے اور مار لے گا۔ سو یوں بھی راد بھر ڈنڈے کھاتا آیا ہوں۔ دیکھو اب میرا بوجہ آدھارہ گیا ہے۔ گدھے بیوقوف نے بھی خچر کی ریس کر کے غوطہ لگایا۔ روئی بھیگ کر اور زونی ہو گئی۔ سرا بھار اتو ہلانہ جاتا تھا۔ خچر پنسا اور کہا کیوں بھائی گدھے کیا حال ہے؟ گدھے نے کہا ”یاڑ میں تو مرا جاتا ہوں۔“ خچر نے کہا ”اے احمد! تو نے میری ریس تو کی لیکن اتنا تو سمجھ لیتا کہ تیری پیٹھ پر روئی بے نمک نہیں۔“ اماں جان، ایمانہ ہو کر لوگوں کی ریس کرنے سے میرا حال اس گدھے کا سامابو۔“

ساس نے کہا ”بھائی تم تو کسی سے تائل ہونے والے ہو نہیں اور نہ میں تمہاری طرح منطق پڑھی ہوں۔ میں تو سیدھی بات یہ جانتی ہوں کہ دس روپے مہینا تم کماتے ہو۔ خدا کا فضل ہے۔ ستا ساں ہے۔ بال بچے نہیں۔ اللہ رکھے دو میاں بی بی۔ خاصی طرح گوشت روئی کھاؤ، نین لکھ، تن زیب پہنو۔ آئندہ کافی فکر تمہاری طرح کیا کریں تو دنیا کا کارخانہ بند ہو جائے۔ نوکری تو نوکری، زندگی کا اعتبار نہیں۔ جتنے دن جینا ہے، پہنی خوشی سے تیر کر دینے پا ہیں۔“

محمد عاقل نے کہا ”یہی تو میں سوچتا ہوں خوشی الگ ہو کر رہنے میں بے یا ساتھ میں؟“

ساس نے کہا ”ویل اور جنت سے کیا مطلب؟ سیدھی بات یہیں کیوں نہیں کہتے کہ مجھ کو ماں سے الگ ہونا منظور نہیں ہے۔ ایک بات تم سے بی بی نے کہیں اس کو قبول کرنے میں تم کو اس بالا کا تامل ہے اور پھر کہتے ہو کہ ہم ان کی خاطرداری میں کمی نہیں کرتے۔ آرام اور خوشی کیا چیز ہے؟ جس میں بی بی خوش ہو اور جس کو وہ آرام سمجھے۔“

اس کے بعد باتوں میں رنجش و تراویش ہونے لگی۔ محمد عاقل نے سکوت اختیار کیا۔ رات بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ محمد عاقل نے ساس سے کہا ”اب آپ آرام کیجئے میں اس مضمون کو پھر سوچوں گا۔“ یہ لوگ تو سوربے محمد عاقل رات بھراستی خیال کی

اوہیڑ بن میں لگا رہا۔ صبح کو اٹھا تو دیکھا کہ اصغریٰ جھاڑو دے رہی بے اس کو دیکھ کر اصغریٰ نے سلام کیا اور کہا ”بھائی صاحب وضو کے واسطے گرم پانی موجود ہے۔“

محمد عاقل نے کہا ”نہیں بھائی، مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔“

اصغریٰ نے کہا ”بھائی صاحب، چلے نہ جائے گا۔ آپ کے واسطے چائے بنائی بے۔ لیکن سادی تیجے گایا دودھ کی؟“

محمد عاقل نے کہا ”جیسی مل جائے۔“

اصغریٰ بولی ”آپ کی آواز کچھ بھاری لگتی ہے۔ شاید نہ لے کی تحریک بے۔ دودھ ضرر کرے گا۔“

محمد عاقل نے کہا ”نز لے کی تحریک تو نہیں۔ رات کو اماں جان کے ساتھ بہت دیر تک باقی کرتا رہا۔ بد خوابی البتہ بے۔“

محمد عاقل نماز پڑھ کر واپس آیا تو دیکھا کہ ساس نماز سے فارغ ہو کر پان کھا رہی ہیں۔ سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اصغریٰ نے سینی ادا کر سامنے رکھ دی۔ چائے دان میں گرم گرم چائے دو پیالیاں دو تیچے اور ایک ٹشتری میں قند۔ محمد عاقل نے چائے پی۔ خوش ذائقہ رنگ، بو باس درست۔ پی کر جی باش باش ہو گیا۔ اکبری حسبِ عادت پڑی سوتی تھی۔ محمد عاقل نے کہا ”اماں جان ان کو بھی نماز کی تاکید کیجئے۔“

ساس نے کہا ”بیٹا یہ اپنی نانی کی بہت چھپتی ہیں۔ ان کی محبت نے ان کی خصلات، ان کی عادت، سب خراب کر رکھی ہے۔ جب یہ چھپوٹی تھیں اور میں کسی بات پر گھر ک بیٹھتی تو کئی کئی دن مجھ سے بولنا چھوڑ دیتی تھیں۔ اور یہ تو کیا مجال تھی کہ اکبری کو کوئی باتھ لگا دے۔ اکبری بات بات پر ضد کرتیں، چیزوں کو توڑتی پھوڑتیں۔ ان کے ڈر کے مارے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اتنی بات پر اکبری کے باپ سے روز بگاڑ رہتا تھا۔“

محمد عاقل رخصت ہونے لگا۔ چلتے چلتے ساس نے کہا ”بیٹا، رات کی بات یاد رکھنا اور ضرور اس کا کچھ بندوبست کرنا۔“

ماں سے محمد عاقل کے الگ ہونے کی صلاح

راوی میں محمد عاقل رات کی ان باتوں کو سوچتا آیا۔ گھر میں پہنچا تو ماں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر فکر معلوم ہوتا ہے۔
سمجھا، ضرور آن سرال میں لڑا۔ پوچھا ”محمد عاقل آخیر میرے کہنے پر عمل نہیں کیا۔“
محمد عاقل: اماں، سچ کہتا ہوں، لڑائی بھڑائی پچھے بھی نہیں ہوئی۔

ماں: پھرست کیوں بے؟

محمد عاقل: کچھ بھی نہیں۔ سوتا اٹھ کر آیا ہوں۔ اس سبب سے شاید آپ کو میرا چہرہ اداس معلوم ہوتا ہو گا۔
ماں: لڑکے اہوش میں آتھ کو سوتا اٹھ کر بھی تھوڑا ہی دیکھا تے۔ سچ بتا، کیا بات ہے؟

محمد عاقل نے آخر مجبور ہو کر رات کا تمام قصہ ماں کے رو روا بیان کیا۔ سنتے کے ساتھ ہی ماں کو کاٹو تو بدن میں ہو نہیں۔
لیکن عورت تھی بڑی داش مند، کہنے لگی ”ہر چند کہ میری تمباڑی تھی کہ جب تک میرے دم میں دم بے، تم سب کو اپنے کیجیے
سے لگائے رہوں اور تم دونوں بھائی اتفاق سے رہو۔ لیکن میں دیکھتی ہوں تو سامانِ لٹھے ہی اٹھے نظر آتے ہیں۔ اُو آن
میں تم سے کہتی ہوں کہ بیاد کے بعد دوسرے مہینے سے مزان دار بھوکا ارادا اُلگ گھر کرنا کے بے۔ تم جو دس روپے مہینے کے
مہینے لا کر مجھ کو دیتے ہوں ان کو نہایت ناگوار ہوتا ہے۔ آئے دن میں تمباڑی بی بی کی سہیلیوں سے سختی رہتی ہوں کہ بھوکلی
ماروں کے محلے میں مکان لیں گی؛ زلفن کو ساتھ لے جائیں گی۔ جب تک یہ سب لڑکیاں اکٹھی بیٹھی رہتی ہیں، یہی مشورہ
یہی مذکورہ آپس میں ربان کرتا ہے۔ میں نے تمباڑی خیالا ساس کے منہ پر ایک مرتبہ یہ بات بھی رکھ دی تھی کہ مزان دار بھوکل
اگر ہمارے ساتھ رہنا تاگوار بتو اپنا کھانا کپڑا اُلگ کر لیں۔ گھر رہیں اسی گھر میں پھر تمباڑی ساس سے معلوم ہوا کہ مزان
دار بھوکل کو یہ بھی منظور نہیں۔ آدمی بیاد خوشنی اور آسانی کے واسطے کرتا ہے۔ روز کی لڑائی، آئے دن کا جنگل رہنا یہی بات
ہے۔ اگر تمباڑی بی بی کو میں منظور ہے اور اُلگ رہنے سے ان کی خوشنی ہے تو بسم اللہ ہم کو عذر نہیں۔ جہاں رہو خوش رہو، آباد
رہو۔ خدا نے ایک مامتا والا دکی ہمارے یتھے لگا دی ہے، سو کبھی تم ادھر کو آنکھے ایک نظر دیکھ لیا، صبر آ گیا۔ گھر کے دھنڈے
سے چھٹکا راما، میں آپ چل گئی، تم کو دیکھ آئی۔“

یہ کہنا تھا کہ محمد عاقل کا جی بھرا آیا۔ بے اختیار روشن شروع کیا۔ سمجھا کہ آن ماں سے جدا ہی ہوتی ہے۔ ماں بھی روئی۔

تحوڑی دیر بعد عاقل نے کہا ”میں تو اُلگ نہیں رہوں گا۔ بی بی رب یا جائے۔“

ماں نے کہا ”ارے بیٹا یہ بھی کہیں ہوتی ہے؟ اشرافوں میں کہیں بی بیاں بھی چھوٹی ہیں؟ تم کو اپنی عمران ہی کے ساتھ کاٹنی ہے۔ ہمارا کیا ہے؟ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آن ترے کل دوسرا دن۔ میری صلاح مانو، جو وہ کہیں سو کرو۔ ہم نے جس دن سے تمہارا بیاہ کیا، اتنی دن سے تم کو الگ سمجھا۔ نہ تم انوکھے بیٹے نہ میں انوکھی ماں۔ کون بیٹا ساری عمر مان کے ساتھ رہا؟“

محمد عاقل نے اپنے دوستوں سے بھی صلاح پوچھی۔ سب نے یہی کہا کہ رفعِ فساد بہتر ہے اور ساتھ رہنے پر کیا مختصر ہے، ماں سے الگ رہو اور ان کی خدمت و اطاعت کرو۔ جب سب لوگوں نے یہی صلاح دی۔ محمد عاقل نے بھی کہا، غیر الگ رہ کر بھی دیجئوں۔ اگر یہ عورت منجل جائے اور گھر کو گھر سمجھئے بد مزاجی، نافرمانی، بذریانی چھوڑ دے تو الگ رہنا ہیب نہیں، گناہ نہیں۔ یہی ناکہ خانہ داری کی فکر کرتا پڑے گی اور تنگی سے گزرے گی۔ سودنیا میں روکر فکر سے کسی حالت میں نجات نہیں۔ اب کچھ فکر نہیں تو ہر روز کا فساد بجائے خود عذاب ہے اور تنگی رزق کا اندیشہ بھی ہے جاہے۔ جو مقدر میں ہے، بہر حال پہنچ گا۔ آدمی کی آجی و تدبیر کو اس میں کیا دخل ہے۔ یہ سوچ کر محمد عاقل نے الگ ہونے کا ارادہ مصمم کر لیا۔ اتفاق سے اسی کے مکان سے متصل ایک مکان بھی خالی تھا۔ ایک روپیہ ماہواری کرائے پڑھبرا لیا بلکہ سرفشی دے کر سرخط بھی لکھ دیا۔ کنجی لے لی اور سرال کہلا بھیجا کہ مکان قرار پا گیا ہے۔ اب آؤ تو نئے مکان میں اٹھ چلیں اور اپنی ماں سے بھی کہہ دیا۔ کچھ اسی اور سرال کہلا بھیجا کہ مکان قرار پا گیا ہے۔ ماں نے جتنا اسبابِ مزان دار بہو کا تھا، کپڑوں کے صندوق، قرتن، فرش، مسیری، پلنگ سب میخدہ کوٹھری میں رکھوا۔ شام کو مزان دار بہو بھی آپنچیں۔ صحیح کوٹھہ ماں نے کوٹھری کھول، محمد عاقل سے کہا تو بھائی، اپنی چیزیں دونوں میاں بی بی خوب دیجئے بحال او۔“

محمد عاقل نے کہا ”اما، تم کیا کہتی ہو؟ کوئی غیر جگہ تھی؟“

ماں نے کہا ”بیٹا، یہ بات نہیں۔ ایسا نہ ہوا تھا نے میں کوئی چیز ادھر ادھر ہو جائے، اور ماں سے کہا ”غظمت، تم اور نمائی یہ سب اس باب تارش والے گھر میں پہنچا دو۔“

اکبری کی سہیلیاں چینیا، رحمت، زلفن، سلمتی آپنچیں اور بات کی بات میں سارا اس باب اٹھا کر ادھر سے ادھر لے گئیں۔

اکبری کا الگ گھر اور اس کی بدانتظامی

مزان دار بہو پنی خوشی نے گھر میں آ کر بیسیں۔ تین دن تک دونوں وقت محمد عاقل کی ماں نے کھانا بھیجا۔ چوتھے دن محمد عاقل نے بی بی سے کہا ”او صاحب، اب کچھ کھانے کا بندوبست شروع ہو۔“

مزان دار نے کہا ”سب اسہاب بے مجھ کانے پڑا ہے۔ یہ رکھا جائے تو فراغت سے ہنڈا چو لیہ کو دیکھوں۔ ابھی تو مجھ کو فرصت نہیں۔“

غرض سات روز تک تصور پر روئی پکتی رہی۔ رات کو کباب اور دن کو ملائی اور کبھی دہی بازار سے منگوائے اور دونوں میاں بیوی روئی کھایتے۔ آخر محمد عاقل نے روز کہہ کر مزان دار سے کھانا پکو دیا۔ مزان دار نے کبھی کھانا پکایا نہ تھا۔ روئی پکائی تو عجیب صورت کی۔ نہ گول نہ چوکھوئی۔ ایک کان ادھر انکا ہوا اور چار کان ادھر۔ کنارے موئے۔ نیچے میں نکیا۔ کہیں جلی کہیں کچھ۔ دھونیں میں کالی۔ اور دال جو پکائی تو وال الگ پانی الگ غرض مزان دار ایسا نہ یہ اور لطیف کھانا پکاتی تھی کہ جس کو دیکھ کر بھوک بھاگ جائے۔ سان بدر گئ بدمزد۔ نمک کبھی زہر اور کبھی پھیکا پانی۔ دو ایک دن تو محمد عاقل نے صبر کیا۔ آخر کار اس نے اپنی ماں کے گھر جا کر کھانا شروع کر دیا۔ مزان دار نے کبھی اپنے آ رام کاٹھ کا نا کر لیا۔ دونوں وقت بازار سے کچوریاں اور ملائی، کندا، کھویا، ریڈی، کباب، منگو اکر کھایا کرتی۔ کھانا جو پکتا، زلفن وغیرہ کھا کر مونی ہوئیں۔ ان بیویوں کے بھاگوں میں چھینکا نہ ٹوٹا۔ لیکن دس روپے مہینے میں یہ چکو تیاں کیوں کر بوسکی تھیں، چکے چکے اسہاب کئے گا۔

محمد عاقل کو اصل اس کی خبر نہ تھی۔

ایک روز محمد عاقل تو نوکری پر گیا تھا، مزان دار بہو و پھر کو سوگئی۔ چینا جو آئی، اس نے دیکھا، بہو بے خبر سوری ہیں۔ اس نے اپنے بھائی میرن کو جاخبر کی۔ وہ بڑا شاطر بد معاش تھا۔ مزان دار تو سوتی کی سوتی رہیں۔ میرن آ کر دن دباڑے تمام برتن چپا کر لے گیا۔ مزان دار اٹھ کر جو دیکھیں تو گھر میں جھاڑو دی ہوئی ب۔ کوئھری کوئنل لگا ہوا تھا۔ اس کا اسہاب تو بچا، جو چیز اور تھی ایک ایک کر کے سب لے گیا۔ اب پانی تک کوئورانہ رہا۔ محمد عاقل نوکری پر سے آیا تو سن کر بہت مغموم ہوا۔ لیکن اب بچھتا ہے کیا ہوت جب چپیاں چک گئیں کھیت۔ بی بی سے خوب لڑا اور خوب اپنا سر چیٹا۔ آخر رو دھوکر بیٹھ رہا۔ قرض دام کر کے بلکی بلکی دو پتیلیاں مول لایا۔ چھوٹے چھوٹے برتن ماں سے مانگ لیے۔ لگن، تو اُر کابی ساس نے بھیج دیئے۔ غرض کسی طرح کام چل نکلا۔

ایک کلٹنی کا اکبری کوٹھگنا

اتفاق سے ان دنوں ایک کلٹنی شہر میں وارد تھی اور ہر جگہ اس کا غسل تھا۔ محمد عاقل نے بھی بی بی سے کہہ دیا تھا کہ کسی اجنبی عورت کو گھر میں مت آنے دینا۔ ان دنوں ایک کلٹنی آئی ہوئی بے۔ کئی گھروں کو لوٹ چکی بے۔ لیکن مزان دار شدت سے بے دقوف تھی۔ اس کی عادت تھی کہ ہر ایک سے جلد کھل مل جاتا۔ ایک دن وہی کلٹنی جن کا بھیں بنا، اس گلی میں آئی۔ یہ مکار جن بے دقوف عورتوں کو پھسالانے کے لیے طرح طرح کے تبر کات اور صد باتیں کی چیزیں اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ تسبیح، خاکِ شفنا، زمزمیاں، مدینہ منورہ کی کھجوریں، کود طور کا سرمہ، خانہ کعبہ کے غاف کا مکڑا، عقیق الحمر اور موٹگے کے دانے اور نادٰ علی، پنچ سورہ اور بہت سی دعائیں۔ گلی میں آ کر جو اس نے اپنی دکان کھولی تو بہت سی اڑکیاں جمع ہو گئیں۔ مزان دار نے بھی سن۔ زلفن سے کہا ”گلی سے اٹھنے لگے تو جن کو یہاں بala لانا۔ ہم بھی تبر کات کی زیارت کریں گے۔“ زلفن جا کھڑی ہوئی اور جن کو بala لائی۔ مزان دار نے بہت خاطر داری سے جن کو پاس بٹھایا اور سب چیزیں دیکھیں۔ سرمہ اور نادٰ علی دو چیزیں پسند کیں۔ جن نے مزان دار کو باتوں ہی باتوں میں تازلیا کر دیا۔ یہ عورت جلد ذہب پر تپہ ہو جائے گی۔ ایک پنیسے کا بہت سا سرمہ تول دیا اور دو آنے کو ناڈلی جواہر کی اور فیر دو آنے کی ایک انگوٹھی تبرک کے طور پر اپنے پاس سے مفت دی۔ مزان دار تبحیر گئی۔ اس کے بعد جن نے مندر کا حال، عرب کی کیفیت اور دل سے جوڑ کر دو چار باتیں ایسی کیں کہ مزان دار نے کمال شوق سے سن اور اس کی طرف ایک خاص انتہا کیا۔ جن نے پوچھا ”کیوں بی تمہارے کوئی بال بچنے میں؟“

مزان دار نے ایک آدھنچ کر کہا ”ہماری تقدیر ایسی کہاں تھی؟“

جن نے پوچھا ”بیاہ کو کتنے دن ہوئے؟“

مزان دار نے کہا ”ابھی برس روزنہ نہیں۔“

مزان دار کی بے عقلی کا اب جن کو یقین ہوا اور دل میں کہنے لگی کہ اس نے تو اولاد کا نام سن کر ایسی آدھنچ جیسے برسوں کا امیدوار۔ جن نے کہا ”نا امیدی کی بات نہیں۔ تمہارے تو اتنے بچے ہوں گے کہ تم سنہال بھی نہ سکو گی۔ البتہ بالفعل اسکیلے گھر میں جی گھبراتا ہو گا۔ میاں کا کیا حال ہے؟“

مزان دار نے کہا ”ہمیشہ مجھ سے ناخوش رہا کرتے ہیں۔“

غرض پہلی ہی ملاقات میں مزان دار نے جن کے ساتھ ایسی بے تکلفی کی کہ اپنا حال جزو کل اس سے کہہ دیا اور جن نے

باتوں ہی باتوں میں تمام بھید معلوم کر لیا۔ ایک پھر کامل جسن پتھی رہی۔ رخصت ہونے لگی تو مزان دار نے بہت منت کی کہ اچھی نبی جس، اب کب آؤ گی؟ جس نے کہا ”میری بھائی موم گروں کے چھتے ہی رہتی ہے اور بہت بیمار ہے۔ اسی کے علاوہ کے واسطے میں آگرے سے آئی ہوں۔ اس کے دوام عالج سے فرصت کم ہوتی ہے۔ مگر انشاء اللہ دوسرے تیرے دون تم کو دیجے جایا کروں گی۔“

انگلے دن جس پھر آموجو ہوئی اور ایک ریشمی از اربند لیتی آئی۔ مزان دار دور سے جس کو آتے دیکھ کر خوش ہو گئی اور پوچھا ”یہ از اربند کیا ہے؟“
جس نے کہا ”بکاؤ ہے۔“
مزان دار نے پوچھا ”کتنے کا ہے؟“
جس نے کہا ”چار آنے کا۔ محلے میں ایک بیگم رہتی ہیں، اب غریب ہو گئی ہیں۔ اسباب بیچ کر گزر کرتی ہیں۔ میں اکثر ان کی چیزیں بیچ دیا کرتی ہوں۔“

مزان دار اتنا سستا از اربند دیکھ کر اولاد ہو گئی۔ نورا پیسے نکال جس کے بال تھے پر رکھ دیئے اور بہت گزگز اکر کہا ”اچھی بی! جو چیز بکاؤ ہوا کرے پہلے مجھ کو دکھا دیا کرو۔“
جس نے کہا ”بہت اچھا۔ پہلے تم پچھپے اور۔“

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ چلتے ہوئے جس نے ایک بٹوانکا لالا، اس میں کپڑے اور کاغذ کی کئی تجویں میں تھوڑی تی اونگیں تھیں۔ ان میں سے دو اونگیں جس نے مزان دار کو دیں اور کہا کہ دنیا میں ملاقات اور محبت اس واسطے ہوا کرتی ہے کہ ایک دوسرے کو فائدہ ہو۔ یہ دو اونگیں میں تم کو دیتی ہوں۔ ایک کو تم اپنی چوٹی میں باندھو، دوسری بہتر تھا کہ تمہارے میاں کی گزگزی میں رہتی۔ پر تمہارے میاں شاید شبہ کریں۔ خیر تیکے میں تی دو اور ان کا اثر آن ہی دیکھ لیما۔ لیکن اتنی احتیاط کرنا کہ پاک صاف جگہ میں رہیں اور اپنے قدم کے برابر ایک کاواہ محو کوتا پ دو۔ میں تم کو ایک گنڈا دوں گی۔ میں جب حج کو گئی تھی تو اسی جہاز میں ایک بھوپال کی بیگم بھی سوار تھیں۔ شاید تم نے ان کا نام سنا ہو، باقیس جہانی بیگم۔ سب کچھ خدا نے ان کو دے رکھا تھا۔ دولت کی کچھ نہ تھا، نوکر، چاکر، اونڈی، غلام، پاکی ناکی سمجھی کچھ تھا۔ ایک تو اولاد کی طرف سے رنجیدہ رہا کرتی تھیں، کوئی بچہ نہ تھا، دوسرے نواب صاحب کو ان کی طرف مطلق انتقام نہ تھا۔ شاید اولاد نہ ہونے کے سبب محبت نہ کرتے ہوں۔ ورنہ بیگم صورت میں چندے آفتاب چندے ماہ تاب۔ اور حسن و دولت پر مزان ایسا سادہ کہ ہم جیسے ہیں جیسے ہیں کو برادر بھاندا اور پوچھنا۔ بیگم کو فقیروں پر پر لے درجے کا اعتقاد تھا۔ ایک دفعہ سنَا کہ تین کوس پر کوئی

کامل وارد ہے۔ اندھیری رات میں گھر سے پیادہ پان کے پاس آئیں اور پہر تک باتھ باندھ کھڑی رہیں۔ فقیروں کے نام کے قربان جائیے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب نے آنکھوں اٹھا کر دیکھا، فرمایا کہ جامائی، رات کو حکم ملے گا۔ بیگم کو خواب میں بشارت ہوئی کہ حج کو جا اور مراد کاموئی سندر سے نکال ل۔ صبح کو اٹھ کر حج کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پانسوسکین بیگم نے آپ کرایہ دے کر جہاز پر سوار کرائے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھی۔ ہر وقت کا پاس رہنا، بیگم صاحب (اللہ دونوں جہان میں سرخ رو) مجھ پر بہت مہربانی کرنے لگیں اور سیلی کہا کرتی تھیں۔ وہ دن تک برادر جہاز پانی میں چا۔ گیارہویں دن تھے سندر کے ایک پیارڈ کھانی دیا۔ ناخدا نے کہا ”کوہ جب شہہ یہی بے۔“ ایک بڑا کامل فقیر اس پر رہتا تھا۔ جو گیا با مراد آیا۔ بیگم صاحب نے ناخدا سے کہا کہ کسی طرح مجھ کو اس پیارڈ پر پہنچا۔ ناخدا نے کہا حضور جہاز تو پیارڈ تک نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ اگر آپ ارشاد کریں تو جہاز کو لنگر کریں اور آپ کو ایک کشتی میں بٹھا کر لے چلیں۔ بیگم نے کہا خیر یہیں ہیں۔ پانچ عورتیں بیگم کے ساتھ کوہ جب شہہ پر گئی تھیں۔ ایک میں اور چار اور۔ پیارڈ پر پہنچنے تو عجیب طرح کی خوشبو مہک رہی تھی۔ چلتے چلتے شاہ صاحب تک پہنچے۔ ہو کام مقام۔ نہ آدمی نہ آدمزاد تباشہ صاحب ایک غار میں رہتے تھے۔ کیسی نورانی ٹھکل تھی، جیسے فرشتہ۔ ہم کو دعا دی، بیگم کو بارہ لوگوں میں اور کچھ پڑھ کر دیا۔ مجھ سے کہا، چل جا۔ آگرے اور دلی میں لوگوں کے کام بنا۔ میں ان بارہ لوگوں میں سے دلوں لگیں یہ ہیں۔ ہم سب حج کر کے اونٹے تو نواب صاحب یا بیگم کی بات نہ پوچھتے تھے یا یہ نوبت ہوئی کہ ایک مینے آگے سے بمبی میں آ کر بیگم کو لینے کو پڑے تھے۔ جوں ہی بیگم نے جہاز پر سے پاؤں اتارا، نواب صاحب نے اپنا سر بیگم کے قدموں پر رکھ دیا اور رورو کر خطا معاف کرائی۔ چھ برس میں بھوپال میں حج سے واپس آ کر تھبیری۔ فقیر کی دعا کی برکت سے لگاتارا اوپر تلے اللہ رکھ کے چار بیٹے بیگم کے میرے رہتے ہو چکے تھے۔ پھر مجھ کو اپنا دلیں یاد آیا۔ بیگم سے اجازت مانگی۔ بہت روکا، میں نے کہا کہ شاہ صاحب نے مجھ کو دلی آگرے کی خدمت پر درکی بنے۔

مجھ کو باس جانا ضرور ہے۔ یہ سن کر بیگم نے چاروں ناچار مجھ کو رخصت کیا۔“

دو لوگوں، اس کے ساتھ دو ورقی کی حکایت دلچسپ۔ مزان دار دل وجہ سے معتقد ہو گئیں۔ جن تو لوگوں میں دے کر رخصت ہوئی۔ مزان دار بھوئے غسل کر، کپڑے بدل، خوشبو لگائی، ایک لوگ بسم اللہ کر کے اپنی چوٹی میں باندھی اور میاں کے پلنگ کی چادر اور تکیوں کے غلاف بدل، ایک لوگ کسی تیکے میں رکھ دی۔ محمد عاقل جو گھر آیا، بی بی کو دیکھا، صاف سحری، پلنگ کی چادر بے کہے بدلي ہوئی۔ خوش ہوا اور اتفاقات کے ساتھ با تین کرنے لگا۔

مزان دار نے کہا۔ ”دیکھو ہم نے آن ایک چیز مول لی بے۔“ یہ کہہ کر از اربند دکھایا۔

محمد عاقل نے کہا ”کتنے کویا بے؟“

مزانِ دار نے کہا ”تم آنکھوں کتنے کابے۔“

وہ از ارب بند خاص لایہور کا بنا ہوا نہایت عمد و تھا۔ چوڑا چکلا، کلا؛ توں کے لجھے دارلڑیں۔ محمد عاقل نے کہا ”دور و پے سے کسی طرح کم نہیں۔“

مزانِ دار: چار آنے کولیا بے۔

محمد عاقل: سچ کبھو۔

مزانِ دار: تمہارے سر کی قسم چار ہی آنے کولیا بے۔

محمد عاقل: بہت ستا بے۔ کہاں سے مل گیا؟

مزانِ دار: ایک جن بڑی نیک بخت بے۔ بہت دنوں سے گلی میں آیا کرتی بے۔ کسی بیگم کا بے بینچے کو لائی تھی۔

یہ کہہ کر سرمہ نادغلی، فیر وہ رے کی انگوٹھی بھی مزانِ دار نے دکھائی۔ طعن ایسی چیز بے کہ بڑا سیانا آدمی بھی دھوکا کھا جاتا بے۔ جنگلی جانور بینا، طوطا، اعل، بلبل آدمی کی شکل سے بھاگتے ہیں، لیکن دانے کی طعن میں جال میں پھنس جاتے ہیں اور زندگی بھر قفس میں قید رہتے ہیں۔ اسی طرح محمد عاقل اپنا فائدہ دیکھ کر رخوش ہوا اور جب مزانِ دار نے کہا کہ وہ جن بیگم کا تمام اسباب جو کلنے کو لئے گا، میرے پاس لانے کا وعدہ کر گئی بے تو محمد عاقل نے کہا ”ضرور دیکھنا چاہیے۔ لیکن ایسا نہ ہو چوری کا مال ہو۔ پیچھے خرابی پڑے۔ ہاں جن کوئی ٹھکنی نہ ہو۔“

مزانِ دار نے کہا ”خد اخذ اکرواد جن ایسی نہیں بے۔“

غرض بات گئی گزری ہوئی۔ محمد عاقل سے جو آنے ایسی باتیں ہوئیں، اوپر اپنے پر مزانِ دار کا اعتقاد جنم گیا۔ اگلے دن زلفن کو سمجھ جن کو بایا اور آنے مزانِ دار بیشی بنیں اور جن کو ماں بنایا۔ رات کے وقت محمد عاقل سے پھر جن کا ذکر آیا۔ محمد عاقل نے کہا ”دیکھو ہوشیار رہنا۔ اس سمجھیں میں کتنیاں اور ٹھکنیاں بہت ہو اکرتی ہیں۔“ لیکن طعن نے خود محمد عاقل کی عقل پر ایسا پرده ڈال دیا کہ اتنی موٹی بات وہ نہ سمجھا کہ دور و پے کامل چار آنے میں کوئی بے وجہ بھی دیتا بے۔ محمد عاقل کو مہنا سب تھا کہ قطعاً جن کے آنے کی ممنوعت کرتا اور سب چیزیں اس کو پھر وا دیتا۔ مزانِ دار کو اتنی عقل کہا تھی کہ اس تھہ کو سمجھتی۔ کئی دن کے بعد مزانِ دار نے جن سے پوچھا ”کیوں بی آنے کل بیگم کا کوئی سامان نہیں لا تیں؟“

جن نے جان لیا کہ اس کو اچھی چاٹ لگ گئی بے۔ کہا ”تمہارے ڈھب کی کوئی چیز لئے تو لاوں۔“ دو چار دن کے بعد جھوٹے موتیوں کی ایک جوڑی لائی اور کہا ”لوبی، خود بیگم کی ننھے کے موتی ہیں۔ نہیں معلوم ہزار کی جوڑی بے یا پانچ سو کی۔ پنامل جو ہری کی دکان پر میں نے دکھائی تھی۔ اٹھو ہو گیا۔ دوسرو پے زبردستی میرے پلے باندھے دیتا تھا۔ میں بیگم سے

پچاس روپے میں لائی ہوں۔ تم لے لو۔ پھر ایسا مال نہ ملے گا۔“

مزان دار نے کہا ”پچاس روپے انقدر تو میرے پاس نہیں ہیں۔“

جن نے کہا ”کیا ہوا ہیئی۔ پہنچیاں بیچ کر لے لو۔ نہیں تو آت یہ موتی بک جائیں گے۔“ جن نے ایسے ڈھب سے کہا کہ مزان دار فوراً اپنا زیور کا صندوق تھا اٹھا لائی اور جن کو پہنچیاں نکال جوا لے کر دیں۔ جن نے مزان دار کا زیور دیج کر کہا ”اے بے! کیسی بے اختیاطی سے زیور مولی گا جبر کی طرح ڈال رکھا بے۔ ہیئی، وہ گدگی میں ڈوراڑا لواؤ۔ بالی پتے، گلو بنڈ، بازو بنڈ میلے چکٹ ہو گئے ہیں۔ میل سونے کو کھائے جاتا بے۔ ان کو اجلواؤ۔“

مزان دار نے کہا ”کون ڈوراڑا لوائے اور کون اجلو کراۓ۔ ان سے کہتی ہوں تو وہ کہتے ہیں مجھے فرصت نہیں۔“

جن نے کہا ”اویٰ ہیئی! یہ کون سا بڑا کام بے۔ لو موتی رہنے دو۔ میں ابھی ڈوراڑا لوادوں اور جوز زیور ملابے نکال دو۔ میں ابھی اجلوادوں۔“

مزان دار نے سب زیور حوالے کیا۔ جن نے کہا ”زلفن کو بھی ساتھ کر دو۔ سنار کے پاس بیٹھی ربے گی۔ میں پتوے سے ڈورے ڈاواؤں گی۔“

مزان دار نے کہا ”اچھا۔“ یہ کہہ کر زلفن کو آواز دی۔ آئی تو جن نے کہا ”لڑکی ذرا میرے ساتھ چل۔ سنار کی دکان پر بیٹھی رہیو۔“

جن نے زیور لیا۔ زلفن ساتھ ہوئی۔ گلی سے باہر نکل کر جن نے رو مال کھوا اور زلفن سے کہا، لا، لا، اجلوانے کا الگ کر لیں اور ڈوراڑا لوانے کا الگ۔ زیور کو الگ کرتے کرتے جن بولی ”ایں! ناک کی کیل کیا ہوئی؟“

زلفن نے کہا ”اسی میں ہوگی۔ ذرا بھر کی تو چیز بے۔ اسی پوٹی میں دیکھو۔“

پھر جن آپ ہی آپ بولی ”اے بے! پان دان کے ڈھکنے پر رکھی رو گئی۔ اری زلفن، ڈوڑ کر جا۔ جلدی سے لے آ۔“

زلفن بھاگی بھاگی آئی اور دروازے سے چاٹائی ”لبی بی ناک کی کیل پان دان کے ڈھکنے پر رو گئی بے۔ جن نے مانگی بے۔ جلدی دو۔ جن گلی کے گلے پر دیبا بننے کی دکان کے آگے بیٹھی بے۔“

یہ کہنا تھا کہ مزان دار بہو کا ماتھا ٹھنکا۔ زلفن سے کہا ”باوی ہوئی بے؟ کیسی کیل؟ میرے پاس کہیں تھی؟ تو نے دیکھی بے؟ اری کم جنت! ڈوڑ۔ کچھ تو جن کہیں چلی نہ جائے۔“

زلفن اٹھے پاؤں دوڑی گئی۔ جن کو ادھر ادھر دیکھا، کہیں پتہ نہ تھا۔ مزان دار سے آ کر کر کہا ”لبی جن کا تو کہیں پتہ نہیں۔ میں بازار تک دیکھا آئی۔ اتنی دیر میں نہیں معلوم کیاں غائب ہو گئی۔“

یہ سن کر مزان دار سر پیٹنے لگی ”ہائے! میں لٹکئی! بائے میں لٹکئی! ارے لوگو! خدا کے لیے دوڑیو۔“
موم گروں کے چھتے تک لوگ دوڑے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ کہیں کی بہتی بہاتی میئین بھر سے کراۓ پر آ کر رہی تھی۔
چار دن سے مکان چھوڑ چل گئی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ محمد عاقل نے آ کر سننا تو سر پیٹ لیا اور ہیوی سے کہا ”اری! تو گھر کو
خاک سیاہ کر کے چھوڑے گی۔ میں تو تجوہ کو پہلے سے جانتا ہوں۔“

مزان دار نے کہا ”چال دور ہو۔ اب با تمیں بنانے کھڑا ہواب۔ ازار بند کیجئے کرتونے مجھ سے کہا تھا کہ نیگام کا اسباب
ضرور دیکھنا۔“

غرض خوب مزے کی اڑائی دونوں میاں بی بی میں ہوئی۔ تمام محل جمع ہو گیا۔ بات پر بات چلی تو معلوم ہوا کہ اتنی جن
نے کچھنی کی گئی میں احمد بخش خان کی بی بی کا تمام زیور اس حیلے سے ٹھنگ لیا کہ ایک فقیر سے دونا کردا دوں گی۔ روئی کے
کڑے میں میاں مستیا کی بیٹی سے ایسی محبت بڑھائی کہ اس کا زیور بہانے سے اڑے لے گئی۔ غرض زیور تو کیا گزر ہوا۔
با تمیں بہت تر رہ گئیں۔ برتن چوری جا چکے تھے۔ زیور یوں عمارت ہوا۔ ہزار روپے کے موتوں کی جوڑی جو لوگوں نے
دیکھی تو تین پیسے کی تھی۔ تھانے میں اطلاع ہوئی۔ لوگوں نے بطور خود بہت ڈھونڈا جس کا سر اٹ نہ ملا پر نہ ملا۔

اکبری کو جیزیر میں جو کپڑے ملے تھے، ان کا حال سنئے۔ جب تک ساس کے ساتھ رہیں، ساس دسویں دن نکال کر دھوپ
دے کرتی تھیں۔ شروع بر سات میں الگ ہو کر رہیں۔ کپڑوں کا صندوق جس کو خڑی میں جس طرح رکھا گیا تھا، تمام
بر سات گز رگئی، اس کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ وہیں اس طرح رکھا رہا۔ جاڑے کی آمد میں دوالائی کی ضرورت ہوئی تو صندوق
کھوا گیا۔ بہت سے کپڑوں کو دیک چاٹ گئی تھی۔ چوہوں نے کاٹ کاٹ کر بخارے ڈال دیئے تھے۔ کوئی کپڑا
سلامت نہیں نہ پہنچنے پایا۔

اکبری کا جتنا حال تم نے پڑھا، اس سے تم کو معلوم ہو گا کہ اکبری کوتانی کے لاڈپیارے نے زندگی بھر کیسی مصیبت میں رکھا۔
لڑکپن میں اکبری نے نہ تو کوئی بہتر سیکھانے کچھ اس کے مزان کی اصلاح ہوئی۔ جب اکبری نے ساس سے جدا ہو کر الگ
گھر کیا، برتن بھانڈا، کپڑا زیور سب کچھ اس کے پاس موجو دیتھا۔ چونکہ خانہ داری کا سایقہ نہیں رکھتی تھی، چند روز میں تمام مال
واسباب خاک میں ملا دیا اور ایک ہی برس میں ہاتھ کان سے بیگی رہ گئی۔ اگر محمد عاقل بھی اس کی طرح احمد اور بد مزان ہوتا
تو شاید ایک دوسرے سے قطع تعلق ہو جاتا، لیکن محمد عاقل نے ہمیشہ عقل و شرافت کو بر رتا۔ ہم کو اکبری کے اتنے حالات
معلوم ہیں کہ اگر ہم سب کو لکھنا چاہیں تو ایسی تین چار کتابیں بنیں مگر اکبری کے حالات پڑھنے سے کبھی تو غصہ آتا ہے اور
کبھی طبیعت کو حصتی نہ ہے۔ اس سے اس کے زیادہ حالات لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کی چھوٹی بہن اصغری کا حال کیوں نہ

لکھیں کہ بات بات پر پڑھنے والوں اور سننے والوں کا سب کامی خوش ہو جائے۔

اصغری کا بیاہ اور اس کا منقصر حال

یہ اڑکی اپنی ماں کے گھر ایسی تھی جیسے گاب کا پھول یا آدمی کے جسم میں آنکھ۔ ہر ایک طرح کا بنر، ہر ایک طرح کا طور سیقنا سے حاصل تھا۔ دانتائی، ہوشیاری، ادب، تقدیر، مرودت، نیک دلی، ملنساری، خدا ترسی، دیا، لحاظ سب صفتیں خدا نے اصغری کو عنایت کی تھیں۔ اڑکپن سے اس کو کھیل کوڑا، بلسی اور چھیڑ سے نفرت تھی۔ پڑھنا یا گھر کا کام کرنا۔ کبھی اس کو وابستہ سکتے یا کسی سے لڑتے نہیں دیکھا۔ محلے کی جتنی عورتیں تھیں، سب اس کو بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں۔ بے شک زب قسم اس ماں باپ کی کہنن کی بیٹی اصغری تھی اور خوشانصیب اس گھر کے جس میں اصغری بہو بن کر جانے والی تھی۔ اب خدا کے فضل و کرم سے اصغری کی عمر تیرہ برس کی ہوئی۔ بات تو اس کی محمد کامل سے ٹھیری ٹھہرائی تھی، اب جب چاہو نیلگا کر مہینا اور دن مقرر ہو جائے۔ ادھر محمد کامل کی ماں اکبری کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ڈرگئی تھی۔ مثل بے دودھ کا جانا چھاپھنگ پھونک کر پیتا بے۔ اکبری کے تصور سے اس کے بدن کے رو گائے کھڑے ہوتے تھے۔ در پردہ محمد کامل کی ماں کا ارادہ تھا کہ چھوٹے اڑکے کی مفتانی کسی اور جگہ کروں کر محمد عاقل کو کسی طرح معلوم ہو گیا اور اس نے ماں سے کہا ”ماں میں نے نہ بے کہ تم محمد کامل کی مفتانی چھڑانی چاہتی ہو۔“

ماں نے کہا ”کیا بتاؤں، بیٹا۔ بڑی سوچ میں ہوں۔ کیا نہ کرو۔ تم سے میری آنکھ سامنے نہیں ہوتی۔ خدا نے مجھ کو تمہارا گنہگار بنا دیا۔ دیکھئے محمد کامل کی قسمت کیسی بے۔“

محمد عاقل نے کہا ”ماں، میں سچ کہتا ہوں، اصغری ہزار اڑکیوں میں سے ایک بے۔ تیر بھر چاش لے کر ڈھونڈو گی تو اصغری جیسی اڑکی نہ پاؤ گی۔ صورت سیرت دونوں میں خدا نے اس کو لائق فائق بنایا بے۔ ہرگز اندیشہ مت کرو۔ بسم اللہ کر کے بیاہ ڈالا اور بڑی بہن پر مست خیال کرو یہ تو آپ نے سنا ہوگا۔“

نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد
خدا نجخ انشت یکساں نہ کرو

اپنا اپنا مزان بے اور اپنی اپنی طبیعت

گل جو چمن میں ہیں ہزار دیکھے ظفر بے کیا بہار
سب کا بے رنگ جدا جدا سب کی بے بو الگ الگ

تمہاری بڑی بہو کو لا جوں والائقہ اصغری سے کیا نسبت

چ نسبت خاک را با عالم پاک

اور خدا اتم میری بات کا یقین کرو۔ مجھ کو اپنے بارے میں تم سے ذرا بھی شکایت نہیں۔ اس خیال کو طبیعت سے نکال ڈاوا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کوئی کسی کے دل میں نہیں گھستا۔ ظاہر حال پر سب کی نظر پڑا کرتی ہے اور ان جام کی خبر خدا کو بنت۔ یوں تو جس کو بہماؤ گی کامل کی بی بی ہو گئی۔ تمہاری بھون ہو گئی اور ہماری بھاون۔ مگر اماں پھر کہتا ہوں کہ اصغری میری جانی بوجھی ہوتی بڑی کی بنت۔ وہ شاید بڑی بہو کو بھی ٹھیک کر لے گی۔ بے تو چھوٹی مگر سارا محلہ اس کا ادب کرتا ہے اور وہ بے بھی اسی تابل۔ دیکھو خدا کے لیے کہیں اصغری کو نہ چھوڑنا۔“

محمد عاقل نے جو اصغری کی اس قد ر اعریف کی توبات کی ہو گئی۔ غرض دونوں سعدھیاں نے کی صلاح سے یہ امر قرار پایا کہ بقرعید کے اگلے دن اصل خیر سے نکاح ہو۔ اصغری کا باپ دوراند ایش خان پیہاڑ پر نوکر تھا۔ اس کو خط گیا۔ خط پہنچتے ہی خان صاحب کی باچیں ہی تو محل گئیں۔ اصغری کو سب بچوں میں بہت چاہتا تھا۔ فوراً رخصت کی درخواست کی۔ جواب صاف ملا۔ بہت زور مارنے ایک نہ چل۔ جاڑے کی آمد تھی۔ دورہ شروع کو تھا۔ بے چارگی، کیا کرتا۔ قہر درو ایش بر جان درو ایش۔ چپ ہو کر بیٹھ رہا۔ لیکن بڑا بیٹا خیر اند ایش خان تھا۔ پانورو پے نقد دے کر اس کو گھر روانہ کیا اور سب پس و پیش سمجھا دیا۔ گھر پر زیور، کپڑا، امرتن سب پہلے سے موجود تھا۔ خیر اند ایش خان نے مکان پر پہنچ کر چاول، گھنی، گیوں، مصالح نمک سب بقدر ضرورت خرید لیا۔ اصغری کے کپڑوں میں مصالح نکانا شروع ہوا۔ ماں کا ارادہ تھا کہ اصغری کو بڑی بہن سے بڑھ جوڑ کر جیزیر ملے۔ جوڑے بھی اس کے زیادہ ہوں۔ برتن بھی استعمال کے وزنی دیئے جائیں۔ زیور کے عدالتی زیادہ ہوں۔ اصغری آخر اتنی گھر میں رہتی تھی۔ جو بات ہوتی اس کو ضرور معلوم ہو جاتی۔ جب اصغری نے سنا کہ مجھ کو آپ سے زیادہ جیزیر ملنے والا بتا تو اس کو رنج ہوا اور اس فکر میں ہوتی کہ کسی تدبیر سے اماں کو منع کر دوں۔ آخر اپنی خالہ زاد بہن تماشا خانم سے شرماتے شرماتے کہا۔ ”میں نے ایسا نہیں۔“ مجھ کو اس نہایت سوچ لگا۔ کئی دن سے نہایت فکر میں تھی۔ الہی کیا کروں! اچھا ہو اتم آنکھیں۔ بوجہ ہم عمری تم سے کہنے میں تامل نہیں۔ کوئی اماں کو اتنی بات سمجھا دے کہ مجھ آپ سے زیادہ ایک چیز نہ دیں۔“

تماشا خانم نے سن کر کہا۔ ”تم بھی بوا کوئی تماش کی عورت ہو۔ وہی کہاوت ہے، گدھے کو نون دیا، اس نے کہا میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ خدا دا اتا ہے۔ تم کیوں انکار کرو؟“

اصغری نے کہا۔ ”تم دیوانی ہو۔ اس میں کئی قباختیں ہیں۔ آپ کے مزان سے تم واقف ہو۔ ان کو ضرور رنج ہو گا۔ حق

ماں سے بد مرگی ہو گی۔ مجھ سے بھی ان کو بدگمانی پیدا ہو گی۔“

تماشا خامن نے کہا ”بواں میں بد مرگی کی کیا بات ہے؟ اپنی اپنی قسمت ہے۔ اور سمجھنے کو سو طرح کی ہاتھیں ہیں۔ ان کی بسم اللہ کی شادی ہوئی۔ روزہ کشانی ہوئی۔ چار برس تک منگنی رہی۔ تیز تیوبار ان کا کون سا نہیں ہوا؟ ان کی کسر ادھر سمجھ لیں۔“

اصغری نے کہا ”چج بے، مگر نام تو جیز کا بے۔ چھوٹی کو زیادہ ملے گا تو بڑی کو رنج ہو گا ہی۔ ایک محلے کا رہنا، روز کا لانا۔ جس بات سے دلوں میں فرق پڑے وہ کیوں کی جائے؟“

تماشا خامن نے کہا ”بہن تا حق تم اپنا نقصان کرتی ہو۔ ابی مہینے دو مہینے میں سب بھول جائیں گے۔“

اصغری نے کہا ”اے بنی اللہ اللہ کرو۔ نفع نقصان کیسا؟ کہیں ماں باپ کے دینے سے پوری پڑتی ہے اور جیز سے عمریں کلتی ہیں؟ خدا اپنی قدرت سے دے۔ تم اس بات میں اصرار مت کرو۔ نہیں تو میں کوئی دوسرا مددیر کروں گی۔“

غرض اصغری کی ماں تک یہ بات پہنچ گئی اور وہ بھی سوق کرایے ارادے سے باز رہیں۔ دل میں کہنے لگیں ”دینے کے سوڈھب ہیں۔ دوسرا جگہ سمجھا لوں گی۔“ الغرض رو ز مقرر رہ کو سامنعت نیک میں نکاح ہو گیا۔ مبارک سلامت ہونے لگی۔ خیر انہیں خاں ایسا منتظم آدمی تھا کہ اسکیلے نے نہایت خوبی کے ساتھ بہن کا بیاہ کر دیا۔ بار ایوں کی مدارات اعلیٰ قدر مراتب خوب ہوئی۔ حق حقوق والوں کو خاصی طرح راضی کر دیا۔ جب اصغری کی رخصت کا وقت آپنچا، مگر میں آفت بر پا تھی۔ ماں پر تو نہایت درجے کا صدمہ تھا۔ محلے کی بیویوں کا یہ حال تھا کہ آکر اصغری کو گلے سے لگا کر روتی تھیں۔ اور ہر ایک کے دل سے دعا ہلتی تھی۔ اصغری ان دعاؤں کا بڑا بھاری جیز لے کر سرال میں داخل ہوئی۔ وہاں کی جو سریمیں تھیں، ادا ہوئیں۔ رونمائی کے بعد اصغری خامن کو تیز دار بہو کا خطاب ملا۔ آگے چل کر تم کو معلوم ہو جاء یگا کہ اصغری خامن نے خانہ داری کو کس طرح سنبھالا، کیا کیا مشکلیں اس کو پیش آئیں اور اس نے اپنی عقل سے کیوں کران کو فتح کیا۔

ذرا اصغری کی حالت کا اکبری کی حالت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ اصغری ماں کی دوسرا بیٹا اور ماں کی دوسرا بھوٹھی۔ دونوں طرف ارمان اور حوصلے اکبری کے بیاہ میں نکل چکے تھے۔ اکبری سوالہ برس کی بیانی گئی تھی اور اصغری بیاہ کے وقت پوری تیرہ برس کی بھی نہ تھی۔ جب اکبری کا بیاہ ہوا اس کا دو لہا محمد عاقل دس روپے کا نوکر تھا اور اصغری کا دو لہا محمد کامل ہنوز پڑھ رہا تھا۔ محمد عاقل کی نسبت محمد کامل کم اور کم عقل تھا۔ اکبری کامل دو برس تک بچوں کے بھیڑ سے آزاد رہی اور اصغری کو خدا نے بیاہ کے دوسرے برس ہی چھوٹی تی عمر میں ماں بنا دیا۔ اکبری کو کبھی شہر سے باہر نکلنے کا اتفاق نہیں ہوا، اصغری برسوں سفر میں رہی۔ پس بہر حال، اصغری کی حالت اکبری کے مقابلے میں اچھی نہ تھی مگر اصغری کی پھٹپن سے

تر بیت ہوئی تھی۔ روز بروز گھر میں برکت زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اکبری کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اور خانم کے بازار میں تمیز دار بہو کا وہ عالی شان محل کھڑا بے کہ آسان سے با تین کرتا بے اور اصغری خانم کے نام ہی سے وہ خانم بازار مشہور ہوا۔ جو ہری بازار میں وہ اوپنجی مسجد جس میں حوض اور کنوں بے، تمیز دار بہو ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ خاص بازار سے آگے بڑھ کر اال ڈگی کی بغل میں تمیز گنج اتنی کا بے۔ مولوی محمد حیات کی مسجد میں اب تک بیس مسافروں کو اس کے لئے
خانے سے خیری روئی اور پنے کا قلیہ دنوں وقت پہنچا کرتا بے۔ قطب صاحب میں اولیاء مسجد کے برادر سرانے اسی تمیز دار بہو کی بنوائی ہوئی ہے۔ رمضان کے رمضان فتح پوری میں بہبیتی کے چھاپے پانسو قرآن اتنی کی طرف سے تقسیم ہوا کرتے ہیں۔ ہر اکمل آتے جائزے میں مسکینوں کو اس کے گھر سے ملتے ہیں۔

جب خیراند ایش خان نے اپنے باپ دوراند ایش خان کو اطلاع کی کہ خدا کے نفل و کرم سے خیر و خوبی کے ساتھ ہمشیرہ عزیز و کاعقد ذی الحجہ کی گیارہویں تاریخ میر فاطمہ پر ہو گیا، دوراند ایش خان نے دور رکعت نماز نسل شکرانہ ادا کی۔ لیکن بیٹی کی مفارقت کا تلاق بہت دنوں تک رہا۔

بیاہی ہوئی لڑکیوں کے لیے عمدہ اصیحت

اصغری کے نام شادی ہو جانے کے بعد دوراندیش خان نے جو خط لکھا، وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ اتفاق سے ہم کو اس کی نقل باتھ آگئی تھی۔ وہ خط یہ ہے:-

آرامِ دل و جانم برخوردار اصغری خانم سلمہا اللہ تعالیٰ۔ دعا اور اشتیاق دیدہ بوتی کے بعد واضح ہو کہ تمہارے بھائی خیر اندیش کے لکھتے سے تمہاری رخصت کا حال معلوم ہوا۔ برسوں سے یہ تمہارا میں تھی کہ اس فرض کو میں اپنے انتظامِ خاص سے ادا کروں مگر حاکم نے رخصت نہ دی۔ مجبور رہا۔ یہ بات تم پر ظاہر ہوئی ہو گی کہ سب بچوں میں تم سے مجھ کو ایک خاص طرح کا انس تھا اور میں اس بات کو بطور اظہار احسان نہیں لکھتا بلکہ تم نے اپنی خدمت گزاری اور فرماس برداری سے خود میرے اور سب کے دل میں جگہ پیدا کی تھی۔ آٹھ برس کی عمر سے تم نے میرے گھر کا تمام بوجھا اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مجھ کو ہمیشہ یہ بات معلوم ہوتی رہی کہ تمہارے سبب بیگم یعنی تمہاری ماں کو بڑی بے فکری حاصل ہے۔ جب کبھی اس اثناء میں مجھ کو گھر جانے کا اتفاق ہوا، تمہارا انتظامِ دیکھ کر ہمیشہ میرا جی خوش ہوا۔ اب تمہارے رخصت ہو جانے سے ایسا نقصان ہوا کہ اس کی تابعی شاید اس نہر میں ہونے کی وجہ کو امید نہیں ہو سکتی۔ خدام تم کو جزوئے خیر دے اور اس خدمت کے صلے میں میری دعاؤں کا اثر تم پر ظاہر ہو۔ خیر اندیش خان کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے اکبری خانم سے زیادہ جیز نہیں لیما چاہا۔ اس سے تمہاری باندوز نظری اور عالیٰ نعمتی ثابت ہوتی ہے۔ مگر میں اس کا نغمہ البدل بھیجا ہوں۔ وہ یہ خط ہے۔ اس کو تم بطور دستورِ عمل کے اپنے پاس رکھو اور ان نصیحتوں پر عمل کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ہر ایک مشکل تم پر آسان ہو گی اور اپنی زندگی آرام و آسانی میں بسر کرو گی۔

سمجھنا چاہیے کہ بیاہ کیا چیز ہے۔ بیاہ صرف یہی بات نہیں کہ رنگین کپڑے پہننے، مہمان جمع ہونے، مال و اسباب و زیور پایا۔ بلکہ بیاہ سے نئی دنیا شروع ہوتی ہے۔ نئے لوگوں سے معاملہ کرنا اور نئے گھر میں رہنا پڑتا ہے۔ جس طرح پہلے پچھڑوں پر جوار کھا جاتا ہے، آدمی کے پچھڑوں کو جوا بیاہ ہے۔ بیاہ ہوا، لڑکی بی بی بنی، لڑکا میاں بنا۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ دونوں کو پکڑ کر دنیا کی گاڑی میں جوت دیا۔ اب یہ گاڑی قبر کی منزل تک ان کو کھینچنی پڑے گی۔ پس یہ بہتر بے کہ دل کو مضبوط کر کے اس مہم کا سر انجام کیا جائے اور زندگی کے دن جس قدر ہوں، عزت، آبرو، صلح کاری، اتفاق سے کاثر دیئے جائیں۔ ورنہ لڑائی، بھڑائی، جنگلے، بکھیرے، شوروں، نسا اور بائے واویا سے دنیا کی مصیبت اور بھی زیادہ تکلیف دہ

ہوتی ہے۔

اب تم کو اے میری پیاری بیٹی اصغری خانم سوچنا چاہیے کہ میاں بی بی میں خدا نے کتنا فرق رکھا ہے۔ مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت علیہ السلام بہشت میں اکیلے گھبرا یا کرتے تھے۔ ان کے بہانے کو خدا نے حضرت حوا کو جو سب سے پہلی عورت دنیا میں ہو گزری ہیں پیدا کیا۔ پس عورت کا پیدا کرنا صرف مرد کی خوشی دلی کے واسطے تھے اور عورت کا فرض بے مرد کو خوش رکھنا۔ افسوس کہ دنیا میں کس قدر کم عورتیں اس فرض کو ادا کرتی ہیں۔ مردوں کا درجہ خدا نے عورتوں پر زیادہ کیا، نہ صرف حکم دینے سے بلکہ مردوں کے جسم میں زیادہ قوت اور ان کی عتماؤں میں روشنی دی ہے۔ دنیا کا بندوبست مردوں کی ذات سے ہوتا ہے۔ مرد کمانے والے اور عورتیں ان کی کمائی کو مناسب موقع پر خرچ کرنے والیاں اور اس کی نگہبان ہیں۔ کہبہ بطور کشی کے بے اور مرد اس کے ملاج ہیں۔ اگر ملاج نہ ہو تو کشی پانی کی موجودوں میں ڈوب جائے گی یا کسی کنارے پر لکر کھا کر پھٹ جائے گی۔ کہبے میں اگر مرد منتظم نہیں تو اس میں ہر طرح کی خرابی کا احتمال ہے۔ کبھی نہیں خیال کرنا چاہیے کہ دنیا میں خوشی صرف دولت سے حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی شکنی نہیں کہ دولت اکثر خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ بہت بڑے اور اونچے گھروں میں اڑانی اور فساد ہم زیادہ پاتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ صرف دولت سے تو خوشی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے اکثر خاندانوں میں خوشی صرف اتفاق اور صلح کاری کے سبب ہے۔ وہ دال روٹی اور گاڑھے دھوتی میں زیادہ آرام سے ہیں، یہ نسبت نوابوں اور بیگم کے جن کا تمام عیش آپس کی سازگاری سے تھے رہتا ہے۔ اے میری پیاری بیٹی اصغری خانم! اتفاق پیدا کرو اور صلح کاری کو غنیمت جانو۔

اب دیکھنا چاہیے کہ اتفاق کن باتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ صرف اس بات سے کہ بی بی اپنے میاں سے محبت کرے بلکہ محبت کے عادوں اس کو میاں کا ادب کرنا بھی لازم ہے۔ بڑی نادانی بے اگر بی بی میاں کو برادر کے درجے میں سمجھے۔ بلکہ اس زماں میں عورتوں نے ایسا خراب دستور اختیار کیا ہے جو ادب کے بالکل خلاف ہے۔ جب چند سہیلیاں آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں تو اکثر یہ تذکرہ ہوتا ہے کہ فلانی کامیاں اس کے ماتھ کس طرح کا برتاب و رکھتا ہے۔ ایک کہتی ہے ”بُو“ میں نے تو یہاں تک ان کو دبایا ہے کہ کیا مجال جو میری بات کو کاٹیں یا الٹ کر جواب دیں۔“ دوسری فخر کرتی ہے۔“جب تک گھریوں خوشنام نہ کریں میں کھانا نہیں کھاتی۔“ تیسری بڑائی مارتی ہے ”میں تو دس مرتبہ پوچھتے ہیں تب ایک جواب مشکل سے دیتی ہوں۔“ چوتھی ڈیگ کی لیتا ہے ”چاہے وہ پھر وہ نیچے بیٹھے رہیں بندی کو پلنگ سے اترنا قسم ہے۔“ پانچویں شیخی بگھارتی ہے ”جو میری زبان سے نکلتا ہے پورا کرا کے رہتی ہوں۔“ شادی بیاہ کے ٹونے ٹونکے بھی اس غرض سے نکلتے ہیں کہ میاں مطیع و فرم اے بردار رب۔ کہیں تو دبن کی جوتی پر کا جعل پاڑ کر میاں کے سرمه لگایا جاتا ہے۔ اس کا

مطلوب یہ ہے کہ عمر بھر جو تیاں کھاتا رہے اور چوں نہ کرے۔ کہیں نہ باتے وقت دُن کے پاؤں کے نیچے بیٹا رکھا جاتا ہے اور میاں کو کھلایا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنے کہ بیرون پڑتا رہے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کا درجہ اور اختیار کم کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ تعلیم بہت بری ہے اور ہرگز قباحت سے خالی نہیں۔ مردوں کو خدا نے شیر بنا یا ہے۔ اگر دباؤ زبردستی سے کوئی ان کو زیر کرنا چاہتے تو ناممکن ہے۔ بہت آسان تر کیاں ان کو زیر کرنے کی خوشامد اور تائیع داری ہے اور جو حمقی عورت اپنا دباؤ ڈال کر مرد کو زیر کرنا چاہتی ہے وہ بڑی غلطی میں ہے۔ وہ شروع میں تھیں فساد ہوتی ہے اور اس کا انجام ضرور فساد ہو گا۔ اگرچہ اس کو بالغ نہیں سمجھتی۔ اصغری خانم! میری صلاح یہ ہے کہ تم لفظًا و روزتہ و برخاست میں بھی اپنے میاں کا ادب لخواز رکھنا۔ نہ ہب میں میاں بی بی کے متعلق بہت سے احکام ہیں اور پونک تم نے قرآن کا ترجمہ اور اردو کے بہت سے مذہبی رسائل پڑھے ہیں، میں امید کرتا ہوں کہ وہ احکام تصور سے بہت ضرور تمہارے خیال میں ہوں گے۔ ان احکام کا مجموعہ خانہ داری کے لیے بڑا مستور اعمال ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ خدا اور رسول ﷺ کے حکموں کی تعمیل میں تن دھی نہیں کرتے اور انہیں انواع و اقسام کی خرابیاں پیش آتی ہیں۔ میں نے حدیث کی کتاب میں پڑھاتھا کہ اگر خدا کے سوائے دوسرے کو بجدہ کرنا روا ہوتا تو یغمبر صاحب ﷺ فرماتے ہیں کہ بی بی کو حکم دیتا کہ اپنے میاں کو بجدہ کیا کرے۔ بس اسی بات سے تم خیال کر سکتی ہو کہ میاں بی بی میں کیا نسبت ہے۔ اب اس کے ساتھ ملکی روانت کو ملاو کر بی بی نہ تو میاں کو چھوڑ سکتی ہے، نہ بدل سکتی ہے نہ اس سے کسی وقت کسی حال میں بے نیاز ہو سکتی ہے تو سوائے اس کے کرتے دل سے آپ اس کی ہور بہ اور اطاعت سے فرمائیں بہادری سے، خوشامد سے، جس طرح ممکن ہو، اس کو اپنا کر کے، عائیت کی، عزت و آبرو کی زندگی پر کرے دوسری تدبیر ہے اور نہ ہونی نہیں ہے۔

کیا وجہ ہے کہ شادی بیاد ایسے چاؤ سے ہوتا ہے اور چوتھی کے بعد ہی بہو سے ماں نہ کا بگاڑ شروع ہو جاتا ہے؟ یہ مضمون غور کے قابل ہے۔

بیاہ کے بعد پہلے بیک لڑکا ماباپ میں ربا اور صرف ان ہی کے ماتھے اس کو تعلق تھا۔ ماں باپ نے اس کو پروش کیا اور یہ تو قن کرتے رب کہ بڑھاپے میں ہماری خدمت کرے گا۔ بیاہ کے بعد بہو ڈولی سے اترتے ہی یہ نکر کرنے لگی کہ میاں آن ماں باپ کو چھوڑ دیں۔ پس لڑائی بیش بہو کی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ اگر بہو کنبے میں مل کر رب اور کبھی ساس کو معلوم نہ ہو کہ میٹے کوہم سے چھڑانا چاہتی ہے تو ہرگز فساد پیدا نہ ہو۔ یہ تو سب کوئی جانتا ہے کہ بیاہ کے بعد ماں باپ کے ساتھ تعلق پندرہ روزہ ہے۔ آخر گھر الگ ہو گا۔ میاں بی بی جدا ہو کر رہیں گے۔ دنیا میں یہی ہوتی آئی ہے لیکن نہیں معلوم کم بخت بہوؤں میں بے صبری کہاں کی پڑھاتی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہوا تی دم ہو جائے۔ بہوؤں میں ایک نیب چغلی کا ہوتا ہے جو

بیاہ فساد بے۔ وہ یہ کہ سرال کی ذرا سی بات آ کر ماں سے لگاتی ہیں اور مانیں خود بھی کھو کر پوچھا کرتی ہیں۔ لیکن اس کہنے اور پوچھنے سے سوائے اس کے لڑائیاں پڑیں اور جگڑے کھڑے ہوں، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بعض بہوئیں اس طرح کی مغروہ ہوتی ہیں کہ سرال میں کیسا ہی اچھا کھانا اور کیسا ہی اچھا کپڑا ان کو ملے، ہمیشہ حقارت سے دیکھتی ہیں۔ ایسی باتوں سے میاں کی دل تکنی ہوتی ہے۔ اصغری اس کی تم کو بہت اختیاط چاہیے۔ سرال کی ہر ایک چیز قابلِ قدر بے اور تم کو ہمیشہ کھانا کھا کر اور کپڑے پہن کر بیٹاشت ظاہر کرنی چاہیے۔ جس سے معلوم ہو کہ تم نے پسند کیا۔ نئی لہن کو اس بات کا خیال بھی ضرور رکھنا چاہیے کہ سرال میں بے دلی سے نہ رب۔ اگر چہ اوپری ہونے کے سبب اجنبی لوگوں میں جی نہیں لگتا؟ لیکن جی کو سمجھنا چاہیے۔ نہ یہ کہ وہ تو ہوئے گئے، باں رب تو وہ تو رب۔ جاتے دیر نہیں ہوئی آنے کا تناضنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ انس پیدا کرنے کے واسطے چاول کاروان بہت پسندیدہ بے۔ اس سے زیادہ نیک کاشوق ظاہر کرنا سرال والوں کو ضرور نہ پسند ہوتا ہے۔

گفتگو میں درجہ اوسط ملحوظ رہے۔ یعنی نہ اتنی بہت کہ خود خود بک بک نہ اتنی کم کہ غرور سمجھا جائے۔ بہت کہنے کا انعام بردا ہوتا ہے۔ جب رات دن کی بکواس ہو گئی، بزراؤں طرح کا تذکرہ ہو گا۔ نہیں معلوم کہ کس تذکرے میں کیا بات مدد سے نکل جائے۔ نہ اتنی کم گوئی اختیار کرنا چاہیے کہ بولنے کے واسطے اوگ خوشامد اور منت کریں۔ ضد اور اصرار کسی بات پر زیاد نہیں۔ اگر کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف بھی ہو، اس وقت ماقوی رکھو۔ پھر کسی دوسرے وقت ابطرز مناسب طے ہو سکتی ہے۔ فرمائش کسی چیز کی نہ کرنی چاہیے۔ فرمائش کرنے سے آدمی نظر وہ سے گھٹ جاتا ہے اور اس کی بات بیٹھ پڑ جاتی ہے۔ جو کام ساس نہیں کرتی ہیں، تم کو اپنے ہاتھوں سے کرنا عار نہ سمجھنا چاہیے۔ چھوٹوں پر مہربانی اور بڑوں کا ادب ہر لمحہ زین ہونے کے واسطے بڑی عدم تدبیر ہے۔ اپنا کوئی کام دوسروں کے ذمے نہیں رکھنا چاہیے اور اپنی کسی چیز کو بے خبری سے پڑانہ رہنے دو کہ دوسرے اس کو اٹھالیں گے۔ جب دو آدمی چپکے چپکے با تیں کریں، ان سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ پھر ان کی تفییش بھی مت کرو کہ یہ آپس میں کیا کہتے تھے اور خواہ خواہ یہ بھی مت سمجھو کہ کچھ ہمارا ہی تذکرہ تھا۔ اپنا معاملہ شروع سے ادب لحاظ کے ساتھ رکھو۔ جن لوگوں میں بہت جلد حد درجے کا اختیاط پیدا ہو جاتا ہے اتنی قدر جلد ان میں رنجش پیدا ہونے لگتی ہے۔ نقطہ میں چاہتا ہوں کہ تم ہر روز بالاضرورت بھی اس خط کو کم سے کم ایک دفعہ پڑھ لیا کروتا کہ اس کا مطلب پیش نظر رب والدعا۔

حرزاد

خیراندیش خان

باپ کا خط پا کر اصغریٰ کے دل میں جوشِ محبت نے عجیب اثر پیدا کیا اور ب اختیار رونے کو جی چاہا۔ لیکن نئی بیا ہی تھی، سرال میں رونے سکی۔ خط کو کام میں لائی اور باپ کے خط کو آنکھوں سے لگا بہت احتیاط سے وظیفے کی کتاب میں رکھلیا۔ ہر رزو بالا نماں کو پڑھتی اور اس کے مطلب پغور کرتی تھی۔

بیاہ کے بعد اصغریٰ کا برتاؤ اور بذریع

انتظامِ خانہ داری میں اس کا داخل

جب تک اصغریٰ نئی بیاہی ہوئی رہی تو اس کا بھی بہت گھبرا تا۔ اس واسطے کے دفعتاً ماں کا گھر چھوڑ کرنے کھرا اور نئے آدمیوں میں رہنا پڑا۔ یہ تو کام اور انتظام کی خوارقہمی بے شغل ایک لگھری ہینہ تھا، یا مینوں بند کوٹھری میں چپ چاپ بیٹھنا پا۔ ماں باپ کے گھر میں جو آزادی حاصل تھی، باقی نہ رہی۔ یہاں سرال میں آتے ہی اس کی ہر ایک بات کو لوگ دیکھنے اور تاکنے لگے۔ کوئی منہ دیکھتا ہے، کوئی چوٹی کی لمباں کو تاپتا ہے، کوئی قد کی اٹھان کو تاڑتا ہے، کوئی زیر ٹھوٹلا تا ہے، کوئی کپڑے پچانتابے۔ کھاتی بے تو اتفق پر نظر ہے، نوالہ کتنا بڑا کھوا، کیوں کر چبایا اور کس طرح نگاہ۔ اٹھتی بے تو دیکھتے ہیں کہ دو پٹہ کیوں کر اوڑھا۔ پانچ کس طرح اٹھائے۔ سوتی بے تو وقت پر نگاہ ہے، کس وقت سوتی، کب اٹھی۔ الغرض جملہ حرکات و سکنات اس کی زیر نظر تھیں۔ ایسی حالت میں اصغریٰ کو سخت تکلیف ہوتی تھی لیکن از بس کے عاقلاً اور تربیت یافتہ تھی، ایسے سخت امتحان میں کامل نکلی اور سب ادائیں اس کی سرال والوں کو بھائیں۔ بات کی نہ تو اس قدر بہت کہ لوگ کہیں، لڑکی بے، چاروں کی بیاہی ہوئی، کس بلا کی بک بک لگا کر ہی بے۔ نہ ایسا کہ ساس نندیں سر تھکا کر بیٹھ رہیں اور یہاں اثر نہ ہو۔ سوتی تو ٹیکھیں۔ کھانا کھایا تو نازیا دو کر مکھے میں چڑھا ہو۔ نہ ایسا کہ ساس نندیں سر تھکا کر بیٹھ رہیں اور یہاں اثر نہ ہو۔ سوتی تو نہ تنا سویرے کہ جہاں میں ہتھی پڑی، لاڈو میری سخت جہنمی اور نہ اتنی دریک گویا مردوں سے شرط باندھ کو سوتی تھی۔

دستور ہوتا ہے کہ نئی دن کو محلے کی لڑکیاں گھیرے رہا کرتی ہیں۔ اصغریٰ کے پاس بھی جب دیکھوؤں پانچ موجود۔ لیکن اصغریٰ نے کسی سے خصوصیت پیدا نہ کی۔ اگر کوئی لڑکی تمام دن بیٹھی رو گئی تو یہ نہ کہا کہ بوا اپنے گھر جاؤ۔ اگر کوئی نہ آئی تو یہ نہ پوچھا کہ یو اتم کہاں تھیں؟ اصغریٰ کے اس طرز ملاقات سے رفتہ رفتہ لڑکیوں کا انبوہ کم ہو گیا۔ خصوصاً محلے کی کمینوں کی لڑکیاں تو چاٹ کر آشنا ہوتی ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ نہ تو پان پر پان ملاتا ہے نہ پچھہ سودے ساف کا تجہ چاہے، کھسیانی ہو کر چھسات دن میں آپ ہی آپ الگ ہو گئیں۔ اصغریٰ نے پسلے ہی اپنی نند محمودہ سے رابطہ بڑھایا۔ محمودہ لڑکی تو تھی ہی، تھوڑے سے اتفاقات میں رام ہو گئی۔ دن بھر اصغریٰ کے پاس گھسی رہا کرتی۔ بلکہ ماں کسی کسی وقت کہہ بھی اٹھتی کہ بادن پر اتنی مہربان ہو۔ بڑی بخاونت کے تو سائے سے تم بھاگتی پھر تی تھیں محمودہ اس کا جواب دیتی ”وہ تو ہم کو مارنی تھیں۔ ہماری

چھوٹی بھابی جان تو ہم کو پیار کرتی ہیں۔“

محمودہ کی ملاقات سے اصغری نے اپنا کام خوب نکالا۔ اول تو تمام گھر بلکہ تمام کنبے اور محلے کا حال محمودہ سے پوچھ پوچھ کر معلوم کیا اور جو بات شروع شروع میں شرم و لحاظ کے سبب خود نہ کہہ سکتی تھی، محمودہ کے ذریعے سے کہا کرتی تھی۔ اصغری نے گھر کے کام میں بتدریج اس طرح دخل دینا شروع کیا کہ شام کو محمودہ سے روئی منگا کر چدائش کی بیان بٹ دیا کرتی۔ ترکاری بنائی۔ محمودہ کا پھٹا ادھڑا کپڑا اسی دیتی۔ ساس اور میاں کے لیے پان بنادیا کرتی۔ شدہ شدہ باور پھی خانے تک جانے اور ما نظمت کو بھوننے گھمارنے میں صلاح دینے لگی۔ بیان تک کہ اصغری کی رائے پر کھانا کپنے لگا۔ جب اصغری نے کھانے میں دخل دینا شروع کیا، گھروالوں نے جانا کہ کھانا بھی عجیب نہتے۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ جس دن اصغری کسی وجہ سے ما نظمت کی صلاح کارنے ہوتی، کھانا پھٹکا پھٹکا پھرتا۔

اصغری نے ما مانعزمت کی چوری پکڑی

وہ لگی اس سے دشمنی کرنے

ہاس بہوؤں کی لڑائی بھی کچھ معمولی بات بے۔ اصغری یوں لڑنے کے قابل نہ تھی تو اس کا ہنر باعثِ فساد ہوا۔ ما ما عزمت اس گھر میں ایسی دخیل کا رہنمی کر کاموں کامدار ایک اس ماما پر تھا۔ سو دا ساف، کپڑا غرض جو کچھ بازار سے آتا سب ما ما عزمت کے باتحوں آتا۔ زیر تک عزمت بنوا کر لاتی۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی تو ما مانعزمت کی معرفت لی جاتی۔ غرضیکہ ما مانعزمت مردوں کی طرح اس گھر کی منتظم تھی۔ جب سے اصغری نے کھانے میں دخل دیا تو ما مانعزمت کا شبن طاہر ہونے لگا۔ ایک دن پسندوں کے کباب پک رہتے تھے اور اصغری باور پچی خانے میں بیٹھی ہوئی ما مانعزمت کو بتاتی جاتی تھی۔ جب گوشت پس کر تیار ہوا اور دہی مصالحے لانے کا وقت آیا، اصغری نے ما ما سے کہا ”وہی مجھ کو چکھا لو۔ ٹھٹا اور بآسی ہو گا تو کباب بگڑ جائیں گے۔“ ما ما نے دہی کا دوڑنا نکال کر اصغری کے باتحوں میں دیا۔ اصغری نے چکھا تو کھٹا چوتا۔ کئی دن کا باتی۔ میلا نیلا پانی الگ اور دہی کی ہٹکلیاں ہٹکلیاں الگ۔ اصغری نے کہا ”اے بے! کیسا برا دہی بے۔ یہ تو ہرگز کبابوں میں ڈالنے کے لائق نہیں۔ ما ما، جلد جاؤ اور ٹنکے کا اچھاتا زد میٹھا دہی دیجئے کر لاؤ۔“

ما ما نے کہا ”اوی یہوی! سیر بھر گوشت کے کبابوں میں ٹنکے کا دہی! اونٹ کے منہ میں زیر د کیا ہو گا؟ یہ دہی جو تم نے ناپسند کیا، ایک آنے کا بے۔“

اصغری کو سن کر حیرت ہوئی۔ بولی کہ ہمارے گھر تو آئے دن کباب پکتے رہا کرتے ہیں۔ ہمیشہ سیر بھر گوشت میں ڈیڑھ پیسے کا دہی پڑتا تھا۔ اس حساب سے تو ٹنکے کا میں نے زیادہ سمجھ کر مٹکا یا کہ کباب خوب نرم اور سرخ ہوں۔“

ما ما نے کہا ”بیوی، تم اپنے محلے کا حساب کتاب رہنے دو۔ بھلا کباں چاندنی چوک اور کباں ترکمان دروازہ۔ جو چیز چاندنی چوک میں پیسے کی بے وہ یہاں ایک آنے کی نہیں ملتی۔ یہ خاک ملا جعلہ تو اجر گی گلری سو ڈلیں بے۔ یہاں ہر چیز کا توڑا بے۔ ہر شے کا تحظر ہتا بے۔“

چونکہ کھانے میں دیر ہوتی تھی، اصغری یہ سن کر چپ ہو رہی اور ما ما سے کہا ”خیر، جتنے کا ملتا ہو، جلد لاؤ۔“ لیکن اصغری ایسی بھوپی نہ تھی کہ ما ما کی بات کو تسلیم کر لیتی۔ اپنے دل میں کہنے لگی ”دل میں ضرور کچھ کالا بے دمڑی چھدام فرق ہو تو مضاائقہ

نہیں۔ یغصب کر ایک شہر کے دو محلوں میں دگنے چو گئے کا فرق۔ ”اس وقت سے اصغری بھی تاک میں ہوئی۔ اگلے دن ما پان لائی تھی۔ اصغری نے دیکھ کر کہا ”ماما تم بالکل ہرے پتے اٹھالا تی ہو۔ ان میں نتو ندست ہوتی بنہ کچھ مزا ہوتا ہے۔ اب تو جاڑے کی آمد بنے کر ارے پکے پان ڈھونڈ کر لایا کرو۔“

ماما نے کہا ”پکے پان تو پسیے کے دو آتے ہیں اور یہاں اللہ رکھ کے آدھی ڈھونڈی روز کا خرچ ہے۔ اس خیال سے میں نئے پان لاتی ہوں۔“

انتہے میں اصغری کے اپنے گھر سے اس کی اپنی ماما نامیت النساء، خیر صلاح کی خبر کو آنکھی۔ پانوں کا تذکرہ تو در پیش تھا ہی اصغری نے اپنی مامے سے پوچھا ”کیوں بی نامیت النساء! تم کو آنکھ کیسے پان ملتے ہیں؟“

نامیت نے کہا ”بیوی پسے کے بارہ۔“

اصغری نے صندوق پر کھول، دو پسیے نامیت النساء کے باتحہ میں دیکھے اور کہا ”اسی محلے کے پنوڑی سے پان لے آؤ۔“

نامیت النساء بڑے کرارے دلدار میں پان لے آئی۔ اصغری نے کہا ”چاندنی چوک کی نسبت بھی پسے چیچے تین پان زیادہ ملے۔“

نامیت النساء نے کہا ”بیوی یہ محلہ شہر کا چھاٹک ہے۔ جو چیز شہر میں آتی ہے اسی دروازے سے آتی ہے۔ گوشہ، اناق، پان، یہ چیزیں اس محلے میں سستی ماتی ہیں۔ البتہ ہری تر کاری سبزی منڈی سے سیدھے کابلی دروازے ہو کر شہر جاتی ہیں۔ وہ کسی قدر مہنگی ماتی ہوگی۔ پرانے پان میں ملنے لیتی تو چالیس ملتے۔“

اصغری نے کہا ”یہ نامرا داما عظمت تو ہر چیز میں یوں ہی آگ لگاتی ہے۔ نامیت النساء تم دو چار دن یہاں رہو۔ میں اماں سے کہاں بھیجوں گی۔ وہاں کا کام دو چار دن میں اور کوئی دیکھے بھال لے گا۔“

نامیت النساء نے کہا ”بیوی میں حاضر ہوں۔ خدا نے کرئے کیا یہاں وہاں دو گھر ہیں۔“

غرض چار دن نامیت النساء کے باتحوں ہر طرح کاسودا بازار سے آیا اور ہر چیز میں ماما عظمت کا ثابت ہوا۔ لیکن یہ سب باقی اس طرح ہوتیں کہ اصغری کی ساس کو خرب تک نہ ہوئی۔ اصغری نے جانا یا نامیت النساء نے یا ماما عظمت نے۔ اس واسطے کہ اصغری بہت مردود اور لحاظ کی عورت تھی۔ اس نے سمجھا کہ اس بڑھیا ماما عظمت کو بد نام اور رسو اکرنے سے کیا فائدہ۔ رات کے وقت کھانے سے فارغ ہو کر کوٹھے پر اصغری پان کھاری تھی۔ نامیت النساء بھی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں ماما عظمت آئی۔ نامیت نے کہا ”کیوں بوا عظمت یہ کیا ماجرا ہے؟ چوری کون نوکر نہیں کرتا۔ دیکھو یہ گھر والی موجود ہیں۔ سات برس تک برادر ان کی خدمت کی۔ کئی برس سے گھر کا سب کاروبار یہ اٹھائے ہوئے تھیں۔ اللہ رکھ کے

امیر گھر اور امیری خرق۔ ہزاروں روپے کا سودا ان ہی باتھوں سے آیا۔ حق دستوری یہ کیوں کر کہیں کہ نہیں لیا۔ اتنا یہا تو ہم نوکروں کا دھرم ہے۔ خدا بخشنے چاہتے مارئے، لیکن اس سے زیادہ ہضم نہیں ہو سکتا۔ آگے بڑھ کر نمک حرامی میں داخل ہے۔

عاظمت نے کہا ”بوا“ امیر احوال کون نہیں جانتا۔ اب میری بلا چھپائے۔ میں تو چرتائی اور اٹتی ہوں۔ لیکن نہ آن سے بلکہ سدا سے میرا بیک کام ہے۔ ذرا میری حالت پر بھی نظر و کروکے اس گھر میں کس بلا کا کام ہے۔ اندر بہار میں اکیل آدمی۔ چار نوکروں کا کام میرے اکیلے دم پر پڑتا ہے۔ پھر بوا بے مطلب تو کوئی اپنی بڈیاں یوں نہیں پیلتا۔ یہوی کئی مرتبہ مجھ کو موقوف بھی کر چکی ہیں۔ پھر آخربھجھی کو بلوایا۔ سمجھ کا پھیسرہ۔ کوئی یوں سمجھا کوئی یوں سمجھا۔ چار آدمی کے بد لے میں اکیل ہوں۔ چار کی تجنواہ بھی مجھ کو اکیل کو ملنی چاہیے۔“

اس ما عظمت کی حقیقت اس طرح بے کہ یہ عورت پچیس برس سے اس گھر میں تھی اور ہمیشہ لوٹنے پر اتارو۔ ایک دن کی بات ہو تو چھپ چھپا جائے، آئے دن اس پر شہر ہوتا تھا۔ مگر تھی چالاک۔ گرفت میں نہیں آتی تھی۔ کئی مرتبہ نکالی گئی۔ جب موقوف ہوئی، بنئے، بزاں، سنا، قصائی، کنجھرے۔ جن سے ان کی معرفت اچاپت قرض اٹھتی تھی، تھانے کو آمو جو د ہوئے۔ اس ڈر کے مارے پھر بائی جاتی تھی۔ یوں چوری اور سرزوری ما عظمت کی تقدیر میں لکھتی تھی۔ جتا کر لیتی اور بتا کر چرتائی۔ دکھا کر نکالتی اور رکا کر نکر جاتی۔ گھر میں آمد نی کم اور عادتیں بگزدی ہوئیں۔ کھانے میں اتیاز، کپڑے میں تکلف۔ سب کارخانہ قرض پر تھا اور قرض کی آڑھت ما عظمت کے دم سے تھی۔ کھلے خزانے کہتی تھی کہ میرا نکلنا آسان بات نہیں۔ گھر نیام کرا کے نکلوں گی۔ اینٹ سے اینٹ بجا کر جاؤں گی۔ اصغری نے جو حساب کتاب میں روک ٹوک شروع کی تو ما عظمت اصغری کی جانی دشمن ہو گئی اور اپنے بچاؤ کے لیے بدله لینے کی نظر سے تدبیر یہ سوچنے لگی اور اس فکر میں ہوئی کہ کامل اور اس کی ماں سے اصغری کو برآ بنائے۔ اصغری کو اس کی مطلق خبر نہ تھی بلکہ اصغری نے جب دیکھا کہ ماں گھر کی مختاری کل بے، نہ اپنی عادت سے بازا آئے گی نہ نہلے گی تو پھر اپنے جی میں کہا کہ پھر حق کی جھک جھک سے کیا فائدہ۔ میں مفت میں ماں سے کیوں بری بنو۔ باور پھی خانے کا جانا اور کھانے میں دخل دینا موقوف کیا۔ گھر والوں کو اصغری کے باتھ کی چاٹ لگ گئی تھی۔ پہلے ہی وقت سے منہ بنانے لگے کوئی کہتاب ”اے بے گوشت منہ میں کچر کچر ہوتا ہے۔“ کوئی کہتا ”وال میں نمک زہر ہو گیا۔“ زبان پر نہیں رکھتی جاتی۔“ لیکن اصغری سے کون کہہ سکتا تھا کہ تم کھانا پکاؤ۔ مجبوراً جیسا ہر ابھلاما عظمت پکار یندھ کر کر کھانا ہی پڑتا تھا۔

اصغری پر ماما کا پہاڑوار

ایک دن، برسات کے موسم میں، بادل گھرا ہوا تھا۔ نہیں تھی پھوار پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چال رہی تھی۔ محمد کامل نے کہا ”آن کڑھائی کو دل چاہتا ہے۔ لیکن بشرطیاً تمیز دار بہواہت قام کریں۔“ اصغری کوٹھے پر راکرتی تھی۔ اس کو خبر نہیں کہ محمد کامل نے کڑھائی کی فرمائش کی۔ ما عظمت گھنی، شکر، بیس وغیرہ سامان لے آئی اور کامل سے کہا ”صاحبزادے نبیجے۔ سب سو داؤں میں لے آئی۔ جاؤں، بہو صاحب کو بلا لااؤں۔“

کوٹھے پر گئی تو اصغری سے کڑھائی کا پکھونڈ کر دیکھ نہیں آیا۔ اسی طرح اٹھے پاؤں اتر آئی اور کہا ”بہو کتنی ہیں میرے سر میں درد بے۔“ ما عظمت سے معمولی کھانا تو پک نہیں سکتا تھا، کڑھائی کیا خاک تلتی۔ سب چیزوں کا ستیا ہاں ملا کر رکھ دیا۔ کس چاؤ سے تو محمد کامل نے فرمائش کی تھی۔ بد مزہ پکوان کھا کر بہت اداں ہوا۔ کوٹھے پر گیا تو بی بی کو دیکھا، نیٹھی ہوئی اپنا پانچاہمہ سن رہی ہیں۔ جی ہی جی میں بہت ناخوش ہوا کہ ایسی! سینے کو سر میں درد نہیں اور ذرا کڑھائی کو کہا تو درسر کا بہانہ کر دیا۔

یہ پہلی ناخوشی محمد کامل کو اصغری سے پیدا ہوئی۔ اور دستور بے کہ میاں بی بیوں میں بگاڑاتی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ از بس کراکش چھوٹی سی عمر میں بیاد ہو جاتا ہے، خدا کے نصل سے مغلل مصلحت انہیں نہ میاں میں ہوتی بہ نہ بی بی میں۔ اگر ذرا تی بات بھی خلاف مزان دیکھی تو میاں اپنے کو اکڑائے بیٹھے ہیں اور بی بی الگ منہ اوندھائے لیئی ہیں۔ اور جب ایک جگہ کا رہنا سنبھا ہو تو مخالفت کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا نیشترا واقع ہونا کیا تعجب ہے۔ یہ مخالفت کثرت سے ہوتے ہوتے دونوں طرف سے لحاظ اور پاس جاتا ہے اور تمام عمر جو یوں میں دال بنتی رہتی ہے۔ سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ میاں بی بی شروع سے اپنا معاملہ دوسروں کے ساتھ صاف رکھیں اور ادنیٰ رنجش کو پیدا نہ ہونے دیں۔ درنہ یہی چھوٹی چھوٹی رنجشیں جمع ہو کر آخوند کو فساہ عظیم ہو جائیں گی۔ رنجش کو پیدا نہ ہونے دینے کی حکمت یہ ہے کہ جب کوئی ذرا سی بات بھی خلاف مزان واقع ہو، اس کو دل میں نہ رکھیں کہ رو در رو کہہ کر صاف کر لیا کریں۔ اگر محمد کامل بی بی سے بطور شکایت پوچھتا کہ کیوں صاحب ذرا سا کام نہ ہو۔ کام سے اور در در کا بہانہ کر دیا؟ اسی وقت دوچار باتوں میں معاملہ طے ہو جاتا اور ما عظمت کی فطرت کھل پڑتی لیکن محمد کامل نے منہ پر تو لگانی مہر اور دل میں دفتر شکایت لکھ چا۔ اصغری کو محمد ک

امل کی کم التفاوتی سے کشکا ہوا اور تجھی کے خدا خیرے کرے! اڑائی کا آغاز نظر آتا ہے۔ سماں کو دیکھا تو ان کو بھی کسی قدر رکھدے پایا۔ حیرت میں تھی کہ ابھی کیا ماجرا ہے!

اصغریٰ ماما کا دوسرا اوار

ابھی یہ بات طنیں ہوئی تھی کہ مامانے ایک شرارت اور کی۔ رمضان کا قرب تھا۔ محمد کامل کی ماں نے ما نظمت سے کہا ”ماہ رمضان آتا بے ابھی سے سب تیاری کر چلو۔ برتن چھونے بڑے سب قائمی کرانے ہیں۔ مکان میں برس بھر ہوا سفیدی نہیں ہوئی۔ الٰہ بزاری مل سے کبوکہ جس طرح ہو سکے کہیں سے پچاس روپے دے دے عید کا خرق سر پر چا آتا ہے۔“

ما نظمت بولی ”تمیز دار ہوا پنی ماں کے باہمہن جائیں گی اور سائب تحصیل دار بھی آنے والے ہیں۔ ضرور دونوں بنیوں کو بلا سمجھیں گے۔ بلکہ ایک جگہ تو اس بات کا نہ کو رتھا کہ تمیز دار ہو کا ارادہ ہے کہ باپ کی ساتھ چلی جائیں۔ بہو جائیں گی تو چھونے صاحبزادے بھی جائیں گے۔ پھر یہوئی تمہارا اکیا دم ہے۔ مکان میں قائمی ہو کر کیا ہو گی اور برتن قطعی ہو کر کیا ہوں گے؟ بزاری مل کم بخت ایسا بے مرود ہو گیا ہے کہ ہر روز تقاضے کو اس کا آدمی دروازے پر کھڑا رہتا ہے۔ وہ قرض کیوں کر دے گا؟“

محمد کامل کی ماں یہ سن کر سرد ہو گئی۔ سرد ہونے کی بات ہی تھی۔ میاں تو جس دن سے لا ہور گئے، پھر کر گھر کی شکل نہ دیکھی۔ چھٹے مینے رسول دن جی میں خیال آ گیا تو کچھ خرق بھیج دیا ورنہ کچھ سروکار نہیں۔ محمد عاقل ماں سے الگ ہو ہی چکا تھا۔ صرف محمد کامل کا دم گھر میں تھا۔ اس کے گئے پیچھے مطاع صاف تھا۔ محمد کامل کی ماں نے ما مانے پوچھا ”اری، سچ بتا۔ تمیز دار بہو ضرور جائیں گی؟“

ماما بولی ”یوئی جانے نہ جانے کی تو خدا جانے۔ جو ساتھا کہہ دیا۔“

محمد کامل کی ماں نے پوچھا ”اری کم بخت، کس سے سن؟ کیوں کر معلوم ہوا؟“

ماما بولی ”سننے کی جو پوچھوتا غایبت النساء سے میں نے دور پے قرض مانگے تھے اس نے کہا کہ میں دے تو دیتی لیکن پیار پر جانے والی ہوں۔ تب میں نے اس سے حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ سب بات ٹھیک تھا کہ ہو چکی ہے۔ بس اتنی دیر بے کہ تحصیل دار آئیں، عید کی صبح کو یہ سب روانہ ہو جائیں گے اور سننے پر کیا خصر ہے، خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پیچانا ہے۔ یوئی، کیا تم کو تمیز دار ہو کے ڈھنگوں سے سمجھ نہیں پڑتا؟ دیکھو، پہلے تو ہو گھر کا کام کا تجھی دیکھتی بھالتی تھیں، اب تو

کوٹھے پر سے نیچے اترنا بھی قسم ہے۔ خط پر خط باپ کے نام چلا آتے ہیں۔ سوائے جانے کے ایسا کون سا معاملہ نہ ہے؟“

محمد کامل کی ماں یہ حال سن کر سنائیں میں روگئی۔ اسی سوق میں بنیٹھی تھی کہ محمد کامل باہر سے آیا۔ محمد کامل کو پاس بالا کر پوچھا
”محمد کامل ایک بات پوچھتی ہوں۔ سچ یقین بتاؤ گے؟“

محمد کامل نے کہا ”اماں بھلا ایسی کون ہی بات نہ جو تم سے چھپاؤں گا؟“

محمد کامل کی ماں نے جو کچھ ماما سے ساختا، حرف بحرف محمد کامل سے کہا۔

محمد کامل نے کہا ”اماں میں سچ کہتا ہوں، مجھ کو اس کی مطلق خبر نہیں۔ نہ مجھ سے تمیز دار بہو نے اس کا تمذکرہ کیا۔“

محمد کامل کی ماں بولی ”ہمارے سامنے کا بچہ اور ہم سے ہی باتیں بناتا ہے۔ انی بڑی بات اور جو کہ خبر نہیں؟“

محمد کامل نے کہا ”تم کو یقین نہیں آتا۔ تمہارے سر کی قسم مجھ کو معلوم نہیں۔“

انتہے میں ماں بھی آنکلی محمد کامل کی ماں نے کہا ”کیوں نبی عظمت محمد کامل تو کہتا ہے مجھ کو معلوم نہیں۔“

ماما نے کہا ”میاں، تم بر امنو یا بھلامانو۔ تمہاری بیوی جانے کی تیاریاں تو کر رہی ہیں۔ تم سے شاید چھپاٹی ہوں یہ مزان دار بہو نہیں کہاں کے پیٹ میں بات نہیں ساتھی تھی۔ یہ تمیز دار بہو ہیں کہ کسی کو اپنا بھیدنہ دیں۔“

محمد کامل کی ماں نے پوچھا ”بھلا محمد کامل یہ بات سچ ہو تو تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

محمد کامل نے کہا ”بھلا یہ کیوں کہو سکتا ہے کہ تم کو اکیا اچھوڑ کر چا جاؤں گا۔ اور تمیز دار بہو کی بھی ایسی کیا زبردستی ہے کہ بے پوچھنے گچھے چلی جائیں گی۔ میں آن تمیز دار بہو سے پوچھوں گا کہ کیوں جی کیا بات ہے۔“

محمد کامل کی ماں نے کہا ”اس نامرا داما کی بات کا کیا اعتبار ہے۔ ابھی بہو سے کچھ منہ کو رمت کرو۔ جب بات تحقیق ہو جائے گی، اس وقت دیکھا جائے گا۔“

اس طرح کی باتوں سے ما نظمت اصغری کو ساس اور میاں سے بر ابنا نے کی فکر میں تھی اور اصغری سے ہر چند کسی نے کچھ کہا نہیں، لیکن وہ بھی ان سب کے قیانے سے سمجھ گئی تھی کہ ضرور کچھ کشیدگی ہے۔ اصغری کے پاس محمود بدھی جاسوس تھی۔ ذرا ذرا اتنی بات اصغری سے کہتی اور ماما کی بد ذاتی بھی سب اصغری پر کھل گئی تھی۔ لیکن اصغری ایسی احمق نتھی جلد بگز بنیٹھتی۔ وہ اس فکر میں ہوئی کہ بھلا نظمت رہ تو آہی۔ انشاء اللہ تعالیٰ تجھ کو بھی کیسا سیدھا بنا تھی ہوں۔ اب یہاں تک تیرے اصغری نے اپنے دل میں کہا کہ بھلا نظمت رہ تو آہی۔ انشاء اللہ تعالیٰ تجھ کو بھی کیسا سیدھا بنا تھی ہوں۔ اب یہاں تک تیرے مغز چل گئے ہیں کہ گھر کے گھر میں فساد ڈاوتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تجھ کو بھی کیسا سیدھا بنا تھی ہوں۔ اب یہاں تک تیرے

اجازوں گی کہ محلے میں آنا نصیب نہ ہو۔

مامانظمت کی شامت سر پر سوار تھی تیسرا اور اصغریٰ پر کیا اور صحیح کیا۔

اصغریٰ پر ماما کا تیسرا اور

ہزاری مل کو تو عادت تھی کہ جب کبھی ماما غلطت کو اپنی دکان کے سامنے آتے جاتے دیکھتا اور بدا کرچھیڑتا کہ کیوں ما، ہمارے حساب کتاب کا بھی کچھ فکر رہے؟ اور ماتویں آجھویں دن گھر پر تقاضا کہلا یہ جتنا۔ ایک دن حسبِ معمول ماما غلطت سودے ساف کو باہر جاتی تھی۔ ہزاری مل نے ٹوکا۔ ماما بولی ”اے الہ، یہ کیا تم نے مجھ سے آئے دن کی چھیڑ خانی مقرر کی بنے؟ جب مجھ کو دیکھتے ہو تقاضا کرتے ہو۔ جن کو دیتے ہو ان سے مانگو۔ ان سے تقاضا کرو۔ میں بے چاری غریب آدمی، نکل کی اوقات۔ مجھ سے اور مہاجنوں سے لین دین سے واسطے؟“

ہزاری مل نے کہا ”یہ بات تم نے کیا کہی کہ مجھ سے واسطہ نہیں؟ دکان سے تو تم لے جاتی ہو۔ ہاتھ کو باہتھ پہچانتا ہے۔ ہم تو تم کو جانتے ہیں اور تمہاری ساکھ پر دیتے ہیں۔ ہم گھر والوں کو کیا جائیں۔“

ماما نے کہا ”اے الہ، ہوش میں آؤ۔ ایسے گھر کے بھولے۔ میری ایسی کیا حیثیت تم نے دیکھ لی؟ میرے پاس نہ جانیداد نہ دولت اور تم نے سینکڑوں روپے آنکھ بند کر کے مجھ کو دے دیئے۔ اگر مجھ کو دیا بے تو تم کو بھی قسم بے جاؤ۔ مجھی سے لے ایسا۔ میرے محل جو کھڑے ہوں گے، سر کار میں عرضی لگا کر نیام کر لیما۔“

ماما کی ایسی الکھڑی الکھڑی باتیں سن کر ہزاری مل بہت سث پلایا اور لگا ماما سے لگاؤٹ کی باتیں کرنے ”آن تو تم کسی سے لڑ کر آئی معلوم ہوتی ہو۔ بتاؤ تو کیا بات بے؟ بیوی صاحب نے کچھ کہایا صاحبزادے کچھ خفا ہوئے؟ بیاں تو آؤ۔“ اور بات سنو۔“

ادھر تو ماما سے یہ کہا اور ادھر دکان پر جو لڑکا بیٹھتا تھا ایک پیسہ اس کے ہاتھ میں دیا کہ دوڑ کر دو گلوریاں تو بنو اکر لاؤ، اور دیکھ ذرا ساز رہ دیکھی الگ ہتھیلی میں لیتے آئے۔ جب ماما بیٹھ گئی تو پھر ہزاری مل نے نہ کر پوچھا ”معلوم ہوتا ہے کہ آن ضرور کسی سے لڑی ہو۔“

ماما نے کہا ”خدا نہ کرے۔ کیوں لڑ نے لگی۔ بات پر بات میں نے بھی کہہ دی۔ رتنی برادر جھوٹ کہا ہو تو اومیرا کان پکڑ لو۔“

ہزاری مل: یہ تو ٹھیک ہے۔ بہوار تو مالک کے ہاتھ ہے۔ پر تمہارے ہاتھوں سے ہوتا ہے یا نہیں؟ نہ تو ہمارے نام رکونہ چھٹی۔ تم نے مالک کے نام جو مانگا سو دیا۔

اما: باں، یوں آبو۔ اس سے میں کہ بکرتی ہوں؟ جو لے گئی ہوں، ہزاروں میں کہہ دوں، لاکھوں میں کہہ دوں۔ اور ہماری بیوی بھی (روئیں روئیں سے دعا لکھتی ہے) بے چاری کبھی تکرار نہیں کرتیں۔

ہزاری مل: ماما نیگم صاحب تو حقیقت میں بڑی امیر ہیں۔ واد! کیا بات ہے۔ پھر ہزاری مل نے آہستہ سے پوچھا ”چھوٹی بھو صاحب کا کیا حال ہے؟ کیسی ہیں؟ اپنی بڑی بہن کے ڈھنلوں پر ہیں یا اور طرح کامزان ہے؟“

اما: اللہ، کچھ نہ پوچھو۔ بیٹی تو امیر گھر کی ہیں پر دل کی بڑی بندگی ہیں۔ دمڑی کا سودا بھی جب تک چار مرتبہ پھیرنا لیں پسند نہیں آتا۔ ہاں خدار کئے جنر سایقدتو دنیا کی بھو بنیوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ کھانا عمدہ سے عمدہ سینے میں درز یوں اور غلابیوں کو مات کیا ہے۔ لیکن اللہ امیری کی بات نہیں۔ اول اول تو مجھ پر بھی روک توک شروع کی تھی۔ سوال اللہ تم جانتے ہو میرا کام کیسا بے لامگ ہوتا ہے۔ آخر کو تھک کر بیٹھ رہیں۔ نیگم صاحب تو اولیاء آدمی ہیں۔ ان ہی کے دم قدم برکت سے گھر چلتا ہے۔ ہم غریب بھی ان ہی کا دامن پکڑے ہوئے ہیں۔ بہتسر الگوں نے نیگم صاحب کو بھڑکایا، لیکن خدا اسلامت رکھے، ان کے دل پر میل نہ آیا اور کسی طرح کا کام انہوں نے منہ پر نہ رکھا۔

ہزاری مل: سنابے چھوٹی بھو صاحب کو بڑا بھاری جبیز ملا۔

اما نے چھوٹے ہی کہا ”خاک بڑی سے بھی اترتا ہوا۔“

ہزاری مل: بڑا تعجب ہے ا ان کے بیاد کے وقت تو خان صاحب تحصیل دار تھے۔ بڑی بیٹی سے زیادہ دین والا زم تھا۔

اما: اے بے تحصیل دار کا کچھ دوش نہیں۔ اس بے چارے نے تو بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں۔ یہی چھوٹی کھوٹی منہ بولی تھیں۔ اما باوا کی خیر خواہی کے مارے کہہ کہہ کے سب چیزیں کم کرائیں۔

ہزاری مل: اگر بہن حال بے تو بڑی بہت کی طرح یہ بھی اللگ گھر کریں گی۔

اما: اللگ کرنا کیسا، یہ تو بڑے گل کھلانیں گی۔ بڑی بھو بد مزان تھیں لیکن دل کی صاف اور یہ زبان کی میٹھی اور دل کی کھوٹی۔ کوئی ایسا ہی جان مار کر کام کرئے ان کی خاطر تلنگیں آتا۔ بات بھی کہیں گی تو تباہ کی۔ منہ پر کچھ دل میں کچھ۔ نہ بابا یہ عورت ایک دن نباہ کرنے والی نہیں۔ اب تو پھاڑ پر باپ کے پاس جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔

ہزاری مل: لا ہور سے ان دونوں کوئی خط آیا؟

اما: ہر روز انتظار رہتا ہے۔ نہیں معلوم کیا سبب ہے۔ کوئی خط نہیں آیا۔ یہی خرق کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ رمضان سر پر آ رہا ہے۔ بلکہ پرسوں اتر سوں مجھ سے کہتی تھی، ہزاری مل سے پچاس روپے اور قرض لانا۔

ہزاری مل قرض کا نام سن کر چونک پڑا اور کہا ”پچھا حساب چکا دیں تو آگے کو کیا انکار ہے۔ بڑی بی، دیکھنا نیگم صاحب کو

اچھی طرح سمجھا کر بدینا کہ جہاں سے بن پڑے روپے کا نکر کریں۔ اب میرے سامنے میرے روکے نہیں رکتے۔ ایسا نہ ہو کل کالاں کو مجھے بات دینی آجائے۔“

اما: تمہارو پیسے خدا ہی نکلوائے گا۔ بیگم صاحب کہاں سے دیں گی۔ بال بال تو قرض دار ہو رہی ہیں۔ مودی الگ جان کھاتا تھا بہزاد جد اشور مچاتا تھا۔

ہزاری مل: مجھ کو دوسرا لین داروں سے کیا واسطہ؟ ہماری دکان کا حساب تو بیگم صاحب کو بے باق کرنا ہی پڑے گا۔ میں تو بیگم صاحب کی سرکار کا بڑا الحاظ کرتا ہوں۔ لیکن میرا ساتھی چھدمانی لاں اب کسی طرف نہیں مانتا۔ اگر وہ یہ حال سن پائے تو آنٹ ناش کر دے۔

اما: یہ سب حال بیگم صاحب سے کہتا تو میں دوں گی، لیکن کاذرا ذرا حال مجھ کو معلوم ہے۔ ناش کرو فریاد کرو نہ روپیہ بے نہ دینے کی گنجائش۔ روپیہ ہوتا تو قرض کیوں لیا جاتا۔

اتنی باتوں کے بعد مانع نظمت ہزاری مل سے رخصت ہو کر سودا سلف لے کر، گھر میں آئی تو محمد کامل کی ماں نے پوچھا ”ماں تو بازار جاتی ہے تو ایسی بے فکر ہو جاتی ہے کہ کھانا پکانے کا کچھ خیال جھکھ کو نہیں رہتا۔ دیکھ تو، کتنا دن چڑھا بے۔ اب کس وقت گوشہ چڑھے گا، کب پکے گا، کب کھانا ملے گا؟“

اما: بیوی، موئے ہزاری مل کے جھگڑے میں اتنی دیر ہو گئی وہ جانہار ہر روز مجھ کو آتے جاتے تو کا کرتا تھا۔ آنٹ میری جان جل گئی اور میں نے کہا کہ کیا تو نے مجھ سے روز کی چھیٹر خانی متر رکی ہے۔ کیوں مراجحتا تھا۔ ذرا صبر کر۔ لا ہو سے خرق آنے والے تو تیرا لگا پچھا سب حساب کتاب بے باق ہو جائے گا۔ وہ موتو میرے سر ہو گیا اور بھرے بازار میں لگا مجھ کو نشیخت کرنے۔

محمد کامل کی ماں: ہزاری مل کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ تو ایمانہ تھا۔ آخر برسوں سے ہمارا اس کا این دین ہے۔ سویرے بھی دیا ہے، دیر کر کے بھی دیا ہے۔ کبھی اس نے نکل رکھیں کی۔

اما: بیوی کوئی اور مہاجن دکان میں سامنے جھی بوابے۔ اس موئے نے جلدی مچا رکھی ہے۔ جس جس پر لینا تھا، سب سے کھڑے کھڑے وصول کر لیا۔ جس نے نہیں دیا، ناش کر دی۔ ہزاری مل نے کہا کہ بیگم صاحب سے بہت بہت باتھ جوڑ کر میری طرف سے کہ دینا کہ میرے اس کی بات نہیں۔ جس طرح ہو سکے دو چار دن دن میں روپے کی راونکال دیں۔ ورنہ چھدمانی لاں ضرور ناش کر دے گا۔

اس خبر کے سنتے ہی محمد کامل کی ماں کی سخت تر دیدرا ہوا۔ امیر بیگم ان کی جھوٹی بہن، خانم کے بازار میں رہتی تھیں۔ وہ

ڈر انوش حال تھیں۔ محمد کامل کی ماں نے ماں غلط سے کہا کہ لا ہور سے تو خط کا جواب تک نہیں آتا۔ خرق کی کیا امید ہے؟ اگرچہ مجھ ہزاری مل نے ناش کر دی تو کیا ہو گا؟ میرے پاس تو اتنا اٹا شے بھی نہیں کہ تھی کراوا کر دوں گی اور ناش ہونے پر دنیا میں بھی بے عزتی ہے۔ نام تو سارے شہر میں بد ہو گا۔ ڈولی لے آؤ میں امیر بیگم کے پاس جاتی ہوں۔ دیکھوں، وہاں کوئی صورت اگر نکل آئے۔

اما: بیوی، ناش تو ہوئی دھڑی ہے۔ جس نے منہ سے کہا اس کو کرتے کیا دیگر لگتے۔ اور جھوٹی بیگم بے چاری کے پاس کہاں سے روپیہ آیا؟ وہ تو ان دونوں خود حیران ہیں۔

محمد کامل کی ماں: آخر پھر کچھ کرنا تو پڑے گا۔

اما نے پاس جا کر چیک سے کہا ”مینے بھر کے واسطے تمیز دار بہو اپنے کڑے دے دیتیں تو بات رو جاتی۔ با فعل ان کڑوں کو گروی رکھ کر آدھے تہائی ہزاری مل کے بھگت جاتے۔ مینے پھر میں میاں یا تو خرق بھیج دیتے یا میں کسی اور مہاجن سے لے آتی۔“

محمد کامل کی ماں: اری، تو کوئی دیوانی ہوئی ہے؟ خبردار! ایسی بات منہ سے بھی مت نکالنا۔ اگر رہنے کا مکان تک بھی بک جائے تو بala سے۔ مجھ کو منظور ہے۔ لیکن بہو سے کہنے کا منہ نہیں۔

اما: بیوی، میں نے تو اس خیال سے کہا کہ بہو ہوئی، بیٹی ہوئی، کچھ غیر نہیں ہوتیں۔ اور کیا خدا نہ کرے کچھ تھی ڈالنے کی نیت ہے۔ مینے بھر کا واسطہ ہے۔ چیز صندوچ میں نہ پڑی رہی، مہاجن کے پاس رکھی رہی، جس میں اس کی خاطر جمع رہے۔

محمد کامل کی ماں: پھر بھی بہو بیٹی میں بڑا فرق ہوتا ہے اور بہو بھی نئی بیاہی ہوئی کہ اگرچہ پوچھ تو ابھی اچھی طرح اس کی گھونگھٹ بھی نہیں کھلی۔ بھلا اس سے کوئی ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ دیکھو، خبردار! پھر زبان سے ایسی بات مت نکالیو۔ ایمانہ ہمودو کے کان میں پڑ جائے اور بہو سے جا لگائے۔

اما: صاحبزادی ابھی تو کھڑی ہوئی سن رہی تھیں۔ مگر ابھی ان کو ان باتوں کی سمجھنیں۔

محمد کامل کی ماں: ڈولی لے آؤ۔ میں بہن تک جاؤں تو آئی۔ پھر جیسی صلاح ٹھبرے گی دیکھا جائے گا۔

محمد کامل کی ماں تو سوار ہو خانم کے بازار سدھاریں اور محمودو نے سب حال تمیز دار بہو کو جانا۔

خط اصغریٰ کی طرف سے

اماکی شرارتؤں کے دفعیے کا آغاز

اصغریٰ کو اور پچھتوں نہ سوچی، فوراً اپنے بڑے بھائی خیراند ایش خال کو یہ خط لکھا:

جناب برادر صاحب معلم مکرم سلامت

تلیمات کے بعد مطلب ضروری عرض کرتی ہوں کہ مدت سے میں نے اپنا حال آپ کو نہیں لکھا۔ اس واسطے کہ جو عریفہ جناب والد صاحب کی خدمت میں بھیتی ہوں، آپ کی نظر سے بھی گزرتا ہو گا۔ اب ایک خاص بات ایسی پیش آئی ہے کہ آپ ہی کی خدمت میں اس کا عرض کرنا مناسب بھیتی ہوں۔ وہ یہ کہ جب سے میں سرال آئی، کسی طرح کی تکمیل مجھ کو نہیں پہنچی اور بڑی آپ کو جن باتوں کی شکایت رہا کرتی تھی، آپ کی دعا سے وہ باتیں میرے ساتھ نہیں ہیں۔ سب لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں خوش رہتی ہوں۔ لیکن ایک ماماغظت کے باخنوں سے وہ ایسا بے جو کسی بد مزان سماں اور بدقسم بند سے بھی نہ ہوتی۔ یورت اس گھر کی پرانی مامب اور اندر باہر کا سب کام اتنی کے باخنوں میں ہے۔ اس عورت نے گھر کو لوٹ کر خاک سیاہ کر دیا۔ اب اتنا قرض ہو گیا ہے کہ اس کے ادا ہونے کا سامان نظر نہیں آتا۔ کسی طرح کا بندوبست گھر میں نہیں ہے۔ میں نے چند روز معمولی کاروبار خانداری میں دخل دیا تھا تو ہر چیز میں شہن، ہربات میں فریب پایا گیا۔ میری روک لوک سے ماما میری دشمن ہو گئی اور اس دن سے ہر روز تازہ فساد لکھ رکھی رہتی ہے۔ اب تک ہر چند کوئی قباحت کی بات پیدا نہیں، لیکن ماما کارہنا مجھ کو سخت ناگوار ہے۔ مگر اس کا لذنا بھی بہت دشوار ہے۔ تمام بازار قرض کا اسی کی معرفت ہے۔ موقوفی کا نام بھی سن پائے تو قرض خواہوں کو جا بھڑکائے۔ پھر قرض کا نہ حساب بے نہ کتاب۔ زبانی تکوں پر سب کا لیما دینا ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ سب لوگوں کا حساب اور قرض لینے کا دستور آئندہ کے واسطے موقوف ہو۔ ماما نکال دی جائے۔ یقین بے کہ جناب والد صاحب کے ساتھ آپ بھی رمضان میں تشریف لا نہیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مہربانی فرمائے کرلا ہو رہو کر آئیے اور ابا جان کو جس طرح بن پڑے کم سے کم دو ہفتے کے واسطے اپنے ساتھ اوازاں آئیے۔ آپ سب لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ بخوبی طے ہو جائے گا۔ میں اس خط کو سخت تشویش کی حالت میں لکھ رہی ہوں۔ مہربان آمادہ ناٹش ہے۔ ماما نے صلاح دی ہے کہ میرے کثرے گروئی رکھے جائیں۔ اماں

جان روپے کے بندو بست کے واسطے تی وقت خالہ جان کے پاس گئی ہیں۔ فقط۔

اوہر تو اصغری نے بھائی کو خط لکھا اور اوہر انی خالہ سے کہا۔ بھیجا کہ میں اکیلی ہوں۔ ابو تماشا خانم کو دودن کے واسطے بھیج دیجئے۔ میں نے سائب کروہ آپ کے یہاں مہمان آئی ہوئی ہیں۔ غرض شاموں شام بی تماشا خانم آپ پہنچیں۔ ذوقی سے اترتے ہی پکاری ”اللہ بنی اصغری! ایسا بھی بے مردوت کوئی نہ ہو۔ میں نے خالوہ با کا خط تم سے بنگوا بھیجا تھا۔ تم نے نہ دیا۔“

اصغری نے کہا ”اوی! کون مانگنے آیا؟“

تماشا خانم بولی ”دیکھو! یہی ما عظمت موجود ہیں۔ کیوں نبی، اس بنتے کو تم ہمارے گھر گئی تھیں۔ میں نے تم سے کہہ دیا تھا یا نہیں؟“

عظمت بولی ”باں نبی، انہوں نے تو کہا تھا، مجھ کم بخت ستری بہتری کو بات یاد نہیں رہتی۔ یہاں آتے آتے گھر کے دھنڈے میں بھول گئی۔“

اصغری نے آہتہ سے کہا ”باں تم کتو اونٹا اور فساد ڈاونٹا یاد رہتا ہے۔“ اور تماشا خانم سے کہا ”خط موجود بے اور ایک نئی کتاب بھی آئی ہوئی بے۔ بڑے مزے کی با تین اس میں ہیں۔ وہ بھی تم لیتے جانا۔“

اصغری نے ماما کا سب حال ذرا ذرا تماشا خانم سے کہا۔ تماشا خانم مزان کی تھیں بڑی تیز۔ اسی وقت جو تی لے کر انجیں اور ماما کو مارنے چلیں۔ اصغری نے ہاتھ پکڑ کر بھالیا اور کہا ”خدا کے لیے آپ ایسا غضب مت کرتا۔ ابھی جلدی کرو۔ سب بات گزر جائے گی۔“

تماشا خانم نے کہا ”تم یوں ہی پس و پیش لگا کر اپنا وقر کھوئی ہو۔ بو، اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو خدا کی قسم مردار کو مارے جو تیوں کے ایسا سیدھا بناتی کہ عمر بھر یا درکھتی۔“

اصغری نے کہا ”دیکھو! نشاء اللہ اس نمک حرام پر نفت کی مار پڑے گی۔ کوئی دن کی دیر بے۔“ اس کے بعد تماشا خانم نے پوچھا ”تمہاری ساس اپنی بہن کے یہاں کس غرض سے گئی ہیں؟“ اصغری نے کہا ”وہ بے چاری بھی اسی نامراہ ماما کے ہاتھوں در بدر ماری ماری پھرتی ہیں۔ کوئی مہاجن بے، اس کا کچھ دینا بے۔ ماما نے آن آن آ کر کہا تھا کہ وہ ناٹش کرنے والا بے۔ اسی کے روپے کی فکر میں گئی ہیں۔“

تماشا خانم پوچھا ”کون سامہجا، نہ ناٹش کرنے والا بے؟“

اصغری نے کہا ”نام تو میں نہیں جانتی۔“

تماشاخانم نے مام سے پوچھا ”عظمت کون سا مہاجن بنے؟“
عظمت: بیوی، ہزاری مل۔

تماشاخانم: وہی ہزاری مل نا جس کی دکان جو ہری بازار میں بنے؟
عظمت: ہاں بیوی وہی۔

یہ سن کر تماشاخانم نے اصغری سے کہا ”اس سے تو ہماری سرال میں بھی یہن دین بنے۔ بھلا کیا موئے کی طاقت بنے جو
ناش کرے۔ میں یہاں سے جا کر تمہارے بھائی جان سے آہوں گی۔ دیکھو تو کیساٹھیک بناتے ہیں۔“
دو دن تماشاخانم اصغری کے پاس رہیں، تیسرا دن رخصت ہوئیں اور چلتے چلتے کہہ گئیں کہ بو اصغری، تم کو میرے سر
کی قسم۔ جب تمہارے سر آئیں اور یہ سب معاملہ مقدمہ پیش ہو، مجھ کو ضرور بلواتا اور عظمت کو تو بس میرے حوالے کر
دینا۔“

وابی محمد کامل کی ماں کو ان کی بہن نے ٹھہرالیا کا کے بنے آپا! کبھی کھماڑ تو تم آتی ہو۔ بھلا ایک ہفتہ تو رہو۔ لیکن آدمی ہر
روز یہاں تمیزدار کی خیر خبر کو آتا تھا۔

ماما کی چوتھی شرارت

اما نظمت نے بیٹھے بٹھائے ایک بد ذاتی اور کی۔ ان دنوں لاٹ صاحب کی آمد آمد تھی، شہر کی صفائی کے واسطے حاکم کی طرف سے بہت تاکید ہوئی۔ ہر محلے اور ہر کوچے میں اشتہار لگائے گئے کہ سب لوگ اپنے اپنے کوچے اور گلیاں صاف کریں۔ دروازوں پر سفیدی کرالیں۔ بدر و نیں صاف رکھیں۔ اگر کسی جگہ کوڑا پڑا ملے گاتو جرمانہ کیا جائے گا۔ اسی مضمون کا ایک اشتہار اس محلے کے پھانک پر بھی لگایا گیا۔اما نظمت جا کر محلے کے پھانک سے واشتہرا را کھاڑا ائی اور چپکے سے اپنے دروازے پر لگا دیا۔ پھر انہیں میرے منہ خانم کے بازار میں محمد کامل کی ماں کو خبر کرنے دوڑی گئی۔ابھی مکان کے کوڑا بھی نہیں کھلے تھے کہ اس نے جا آواز دی۔ محمد کامل نے آواز پہچانی اور کہا ”ارے دوڑو! کوڑ کھولو! عظمت ایسے ناوقت کیوں بھاگی آئی بے۔“

عظمت سامنے آئی تو پوچھا ”ماخیر بہت بے؟“

عظمت بولی ”بیوی! مکان پر واشتہار و شتار کیا ہوتا ہے (اے بے مجھ رندیا کو تو سیدھا نام بھی نہیں آتا) لگا ہوابے۔ معلوم ہوتا ہے ہزاری مل نے ناش کر دی۔“

محمد کامل کی ماں نے اپنی بہن سے کہا ”لو بلو! میں تو جاتی ہوں۔ ہزاری مل کو بلوا کر سمجھاؤں گی۔ خدا اس کے دل میں رحم ڈالے۔“

بہن بولی ”آپا! میں شرمند ہوں کہ مجھ سے روپے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ لیکن میرے لگلے کاتوڑا موجود ہے۔ اس کو لیتی جاؤ۔ گروئی رکھنے سے کام نکلنے تو خیر، ورنہ ڈالنا۔“

محمد کامل کی ماں نے کہا ”خیر، میں توڑا لیے جاتی ہیں۔ مگر اس کاروپیہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک توڑے سے کیا ہو گا؟“

بہن بولی ”آخر انہوں نے بھی تو کہا بے کہ میں کسی دوسرے مبارکن سے قرض لا دوں گا۔ تم بسم اللہ کر کے سوار ہو۔ وہ آتے ہیں تو میں ان کو بھی پیچھے سے بھینتی ہوں۔“

غرض محمد کامل کی ماں مکان پر پہنچی۔ دروازے پر اتری۔ اشتہار لگادیکھا۔ افسوس کی حالت میں چاپ آ کر بیٹھ گئیں۔ سماں کی آمد کا سن کر اصغریٰ کوٹھے پر سے اتری۔ سلام کیا۔ سماں کو مغموم دیجئے کر پوچھا ”آن اماں جان آپ کا چبرہ بہت اداں بنے۔“

سماں: مبارکن نے ناش کر دی بے۔ روپے کی صورت کہیں سے ہن نہیں پڑتی۔ امیر بیگم نے جواب دے دیا اور

مکان پر اشتہار لگ چکا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

اصغری: آپ ہرگز اس کافکرنہ سمجھئے۔ اگر ہزاری مل نے ناش کر دی بے تو کچھ حزن نہیں۔ تماشا خانم کی سرال میں اس کا لین دین بے۔ تماشا خانم نے مجھ سے لپا وعدہ کیا ہے کہ ہزاری مل کو سمجھا دوں گی اور اگر نہیں مانے گا تو اس کے روپے کی کچھ نبیل ہو جائے گی۔ آپ اتنا فکر کیوں کرتی ہیں؟ ہزاری مل کو جواہی طرف سے کرنا تھا کہ چکا۔

ساس: کامل ہوتا تو اس کو ہزاری مل کے پس بھیجنی۔

اصغری: یوں آپ کو اختیار بے لیکن میرے زدیک مجاہد نے ڈرنا کسی طرح مناسب نہیں اور نہ اس کو آئندہ کے واسطے دلیری ہو جائے گی اور آئے دن ناش کا ڈراؤ ادا کیا کرے گا۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ ادھر کا اشارہ نہ ہو اور باہر سے کوئی دباو اس پر نہ پڑ جائے کہ ناش کی پیروی سے باز رہے۔

محمد کامل کی ماں: تماشا خانم ابھی لڑکی ہیں۔ کچھری دربار کی باتیں کیا جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے بھروسے کام مگر جائے اور موئی باتھ سے جاتا رہے۔

اصغری: تماشا خانم بے شک لڑکی ہیں مگر میں نے بات خوب کپی کر لی ہے اور مجھ کو اطمینان ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میاں مسلم نے دروازے پر آواز دی۔ اصغری نے کہا ”دیکھئے، مسلم آیا ہے۔ ضرور اس معاملے کی کچھ خبر لایا ہو گا۔“ اصغری نے محمود کو اشارہ کیا۔ محمود کوٹھری میں چل گئی۔ مسلم کو اندر بایا اور پوچھا ”مسلم کیا خبر لائے؟“

مسلم نے کہا ”آپ نے سلام کیا ہے اور مزان کا حال پوچھا ہے اور کہا ہے کہ ہزاری مل کو بلوایا تھا۔ بہت کچھ ڈرایا دھمکایا ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ ناش نہ ہو گی۔“

یہ بات سن کر محمد کامل کی ماں کی کسی قدرتی ہوئی۔ لیکن اصغری حیرت میں تھی کہ تماشا خانم نے تو یہ کہا۔ بھیجا ہے کہ ہزاری مل ناش کر بیخا۔ یہ کیا بات ہے؟ اور اشتہار کا معاملہ بھی عجب ہے! میں مگر میں بیٹھی رہی۔ مجھ کو خبر نہیں۔ حاکم کا اشتہار ہوتا تو کوئی چیز اسی پیادہ پکارتا، آواز دیتا۔ مسلم رخصت ہوا تو محمود سے اصغری نے کہا ”جاؤ“ دروازے پر جو کاغذ لگا ہوا بے، اس کو چپکے سے اکھاڑا لو۔“ محمود کا گذرا کھاڑا لائی۔ اصغری نے پڑھا تو صنانی کا حکم تھا۔ ناش کا کچھ ڈریں کو رہنے تھا۔ سمجھ گئی کہ یہ بھی اس غرضت کی چالا کی ہے۔ ساس پر تو حال ظاہر نہیں کیا لیکن ان کا اچھی طرح اطمینان کر دیا کہ آپ دل جھنی سے بیٹھی رہیے۔ ناش کا ہرگز کھلکھلانہ نہیں۔

اصغری نے کس حکمت سے اپنے میاں کو

شب برات میں انار پٹانے خے چھوڑنے سے باز رکھا

سماں نے کہا ”تمہارے کہنے سے ناش کی طرف سے تodel جمی ہوئی۔ لیکن شب برات اور رمضان سر پر چلا آتا ہے۔

دونوں چواروں میں خرق ہی خرق ہے۔ لاہور سے خط آنا موقوف ہے۔ خرق کا نکر تو میر ابو خشک کیے ڈالتا ہے۔“

اصغری نے کہا ”رمضان کے توابھی بہت دن پڑے ہیں۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس وقت تک غیب سے کوئی سامان پیدا ہو جائے گا۔ ہاں شب برات کے تو چار ہی دن رد گئے ہیں۔ سو شب برات کوئی ایسا چوارہ نہیں جس میں بہت خرق درکار ہو۔“

سماں نے کہا ”میرے گھر تو سال در سال شب برات میں نہیں روپے اٹھتے ہیں۔ پوچھو یہی عظمت خرق کرنے والی موجودت ہے۔“

اصغری نے کہا ”خرق کرنے کا عجب ہے، لیکن ایک ضرورت کے واسطے اور ایک بے ضرورت۔ سو شب برات میں کوئی ایسی ضرورت نہیں جس کے واسطے اتنا روپیہ درکار ہو۔“

سماں نے کہا ”بوا، پیر، پیغمبر، بڑے بزرگوں کی فاتح مقدم ہے۔ بچروں گوں کے گھر بھینجا بھجوہا ضرور ہے۔ او، کہنے کو ذرا تی بات ہے۔ پانچ روپے کی ایک رقم تو اصل خیر سے تمہارے میاں اور بی بی محمود کے انار پٹاخوں کی ہے۔ محمد کامل کا بیاد ہو گیا ہے تو کیا ہے، خدار کھے اس کے مزان میں تو ابھی تک بچپن کی باتیں چلی آتی ہیں۔ جب تک سوانا، نہیں گذی پٹانے نہ لے چکے گا، میری جان کھا جائے گا اور محمود بھی رو رو کے بر احوال کر لے گی۔“

اصغری: اماں جان مسلمانوں میں شب برات کی کچھ رسم تی پڑ گئی ہے ورنہ دین میں تو اس کی کچھ اصل و صل ہی نہیں ہے۔ ہمارے ابا کوشب برات کی ایسی چیز ہے کہ دوسروں کے بیہاں کا آیا ہوا یٹھانہ آپ کھائیں اور نہ ہم لوگوں کو کھانے دیں۔ اول تو ابا شہر میں جم ہی جم ہوتے ہیں، لیکن جس برس آپا کا بیاد ہوا، ان کوشب برات یہیں ہوئی تھی۔ اماں بتیرا لڑیں، جنگلزیں مگر ابا نے کہا، میں تو یہ بدعت اپنے گھر میں ہونے دینے کا نہیں۔ اور یوں خرق کو ہو تو مجھ سے دس کی جگہ نہیں اور غریبوں کو دوپر شب برات کے نام سے تو میں ایک پھوٹی کوڑی دینے والا نہیں۔

اصغری کی ساس: تمہارے سر کا بھی یہی کہنا نہ۔ شب برات کا حلو، عید کی سویاں، یوی کا کوڈا، صحنک، منت، عرش، قبروں کی چادر، پنگھا، بستن، پھول والوں کی سیر، سلطان جی کی ستر ہویں، سہرا، گنگا، منڈھا، نوبت، نقارہ، ڈھولک ساچن، آرائش، موالی تو سب ہی چیزوں کو منع کرتے ہیں۔ پر کم بخت دنیا بھی تو نہیں چھوڑی جاتی۔ اب کسی کے یہاں سے حصہ بخڑ آئے تو خواہی نہ خواہی لیما ہی پڑتا ہے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جیسے بمسانی کہا کرتی ہیں کہ لیما روا، دینے کے نام کو الٹا تو۔ پھر گھر کے مردوں کے نام سے یوں تو کون دیتا ہے۔ برسوں دن تیور بار کے بیانے ان کی ارواح کو دوچھاتی اور کوڑی بھریٹھے کا ثواب پہنچ جاتا ہے تو اس سے کیا گئے گزرے ہوئے؟

اصغری: ایسا ہی شب برات کا کرنا ضرور ہے تو فاتح کے واسطے پانچ چھر کا بھی باہت ہو گا۔ رہا بھیجننا بھجوانا تو ادھر سے آیا، ادھر گیا۔ اور محمود دا ب پانخوں کے واسطے ضد نہیں کریں گے۔ میں ان کو سمجھا لوں گی۔ غرض شب برات تو میری طرف سے آئی گئی ہوئی۔ اس کے واسطے آپ قرض کا فکر نہ کیجئے۔ کسی معمول میں بھی کی ہو تو مجھ کو الا ہنا دیجئے۔

ہاس سے تو یہ باتیں ہوئیں لیکن اصغری سوق میں تھی کہ میاں کو ازار پانخوں سے کس طرح باز رکھوں گی۔ آخر کار اس حکمت سے اصغری نے میاں کو سمجھایا کہ بات بھی کہہ گز ری اور میاں کو ناگوار بھی نہ ہوا۔ محمد کامل کے سامنے چھیڑ کر محمود د سے پوچھا ”کیوں بو؟ تم نے شب برات کے واسطے کیا تیاری کی؟“

محمد دبولي ”بھائی ازار پلانے لانیں گے تو ہم کو بھی دیں گے۔“

ابھی محمد کامل کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ اصغری نے کہا ”بھائی ایسی وابیات چیز تمہارے لیے یوں لانے لگے؟ ازار پانخوں میں کیا مرا ہوتا ہے؟“

محمد د: بھائی جان، جب ازار پلانے چھوٹتے ہیں تو کیسی بہار ہوتی ہے۔

اصغری: محلے میں سینکڑوں ازار چھوٹیں گے۔ کوئی پر سے تم بھی دیکھ لیما۔

محمد د: واد! اور ہم نہ چھوڑیں؟

اصغری: تم کوڈ رنیں لگاتا؟

محمد د: میں اپنے باتھوں سے تھوڑے ہی چھوڑتی ہوں۔

اصغری: پھر جس طرح تم نے اپنے ازار چھوٹتے دیکھئے ویسے ہی محلے کے۔ اور محمود سفؤیہ بہت برکھیل ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے محلے میں ایک لڑکے کے ہاتھ میں ازار پھٹ کر چوپٹ ہو گئیں اس کو دیکھنا بھی ہو تو دور سے۔ اور محمود تم اماں جان کا حال دیکھتی ہو؟ اوس ہیں یا نہیں؟

- محمودہ: اداں تو ہیں۔
 اصغری: کبھی تم نے یہ بھی غور کیا کہ کیوں اداں ہیں؟
- محمودہ: یہ تو معلوم نہیں۔
 اصغری: واد! اتنی پرتم کہتی ہو کہ میں اماں کو بہت چاہتی ہوں۔
- محمودہ: اچھی بجا بھی جان، اماں کیوں اداں ہیں؟
 اصغری: خرق کی تلگی بے۔ مہماں قرض نہیں دیتا۔ اس سوق میں ہیں کہ محمودہ اماں کو واسطے خدکرے گی تو کہاں سے دوں گی۔
- محمودہ: تو ہم اماں نہیں منگائیں گے۔
 اصغری: شبابش! شبابش! تم بہت ہی اچھی بیٹی ہو (اور محمودہ کو گلے لگا کر پیار کیا۔)
- محمودہ: اگلے برس جب خدا کرے گا، اماں کا باتحہ بافراغت ہو گا، ابا خرق بھیجیں گے تو اب کے بدے کے اماں پلانے بھی ہم سب ہی چھوڑیں گے۔ کیوں نہ بجا بھی جان؟
 اصغری: چھوڑ تو لوگی مگر محمودہ اماں پلانوں کا چھوڑنا گناہ کی بات بے۔ اللہ میاں بڑے ناراض ہوتے ہیں۔
- محمودہ: اے بے! پھر یہ سب لوگ جو آتش بازی چھوڑتے ہیں؟
 اصغری: لوگوں کی بھلی چالائی۔ لوگ جھوٹ نہیں بولتے؟ چوری نہیں کرتے؟ پرایا حق نہیں مارتے؟
- محمودہ: پھر ہم کو اماں جان نے تو کبھی منع نہیں کیا۔
 اصغری: اس خیال سے کہتمہارا جی کڑھے گا۔
- محمودہ: بھلا اس میں گناہ کی کیبات بے؟ کسی کے لگنے جائے؟
 اصغری: محمودہ اللہ تعالیٰ کے یہاں چل کر رتنی کا حساب دینا ہو گا۔ اماں پلانے تو بڑے داموں کی چیز بے، اگر کوئی آدمی پانی بھی بے سبب اندھاتا بے اس سے بھی اللہ میاں پوچھیں گے کتو نے ہمارا پانی بے وجہ نہ حایا کیوں؟ اسی طرح پروقت کا روپے پیسے کا، کھانے کا، کپڑے کا، تن درستی کا، غرض خدا نے جتنی نعمتیں اپنی مہربانی سے دی ہیں، سب کا حساب کتاب دینا پڑے گا۔ اور جب تم بتاؤ گے کہ ہم نے اتنے پیسوں کے اماں پلانے لیے، اللہ میاں کہیں گے کہ تم نے یہی پیسے کسی غریب محتاج کو کیوں نہ دیئے؟ لوگ بھوکے مریں اور کوڑی کوڑی کو تریں اور تم میری دی ہوئی دولت کو یوں آگ لگاؤ۔ اس وقت محمودہ تم کیا جواب دوگی؟ تم اللہ میاں سے ڈرتی نہیں؟

- محمودہ: اے بے! بھا بھی جان، اب کیا کروں؟
 اصغری: آگے کلو بے کرو۔
- محمودہ: تو اللہ میاں میری خطاء معاف کر دیں گے؟
 اصغری: بے شک معاف کر دیں گے۔ وو تم کو ماں جان سے بہت زیادہ چاہتے ہیں۔
- محمودہ: اللہ میاں مجھے اتنا کیوں چاہتے ہیں؟
 اصغری: اس واسطے چاہتے ہیں کہ انہوں نے تم کو بنایا بے پیدا کیا بے۔ تم اپنے پالے ہوئے بلی کے بچے کو کیسا چاہتی ہو۔
- محمودہ: تو کیسے تو بے کروں؟
 اصغری: دل سے پکا ارادہ کرو کے پھر ایسا نہیں کرو گی۔
- محمودہ: میں انار پٹا خے منگوانے کی بھی نہیں، اور کوئی مفت بھی دے گا تو نہیں اول گی۔
 اصغری نے پھر محمودہ کو پیار کیا۔ محمد کامل چپ بیٹھا ہوا یہ سب بتیں سن تارہا۔ چونکہ معقول بات تھی، اس کے دل نے قبول کر لی۔ اسی وقت یونچ اتر کر ماں کے پاس گیا اور کہا ”ماں، میں نے سنا بے تم شب برات کی سوچ میں بیٹھی ہو۔ تم میرا فکر مت کرو۔ مجھ کو انار پٹا خے در کار نہیں اور محمودہ کہتی بے کہ میں نہیں منگا دوں گی۔ اور ہم دونوں نے تو بھی کر لی بے۔“
 غرض خرق کی ایک رقم تو یوں کم ہوئی۔ فاتح کے واسطے درو روپے میں خاصا یٹھا بن گیا۔ بھینے کے واسطے اصغری نے خود انتمام کیا۔ جب باہر سے حصہ آیا، گھر میں نہ تھہر نے دیا۔ دے کر آدمی باہر نکلا اور اس نے کہا فلانی جگہ پہنچا دو۔ جس جس کو دینا تھا سب کو نام پہنچ گیا اور درو روپے میں اچھی خاصی شب برات ہو گئی۔ غظمت یہ بندوبست دیکھ کر جل ہی تو گئی۔
 اس واسطے کیس کی بڑی رقم ماری گئی۔ جتنا باہر سے آتا وہ سب لیتی، اور جو گھر سے جاتا آدھا اس میں سے نکلتی۔ اور شب برات کا حلوا جو خشک کر رکھتی تھی، ہمیں یہ بخیری کی طرح پھانکتی۔

اصغری کے باپ اور سرے کا آنا، لوگوں کا حساب کتاب

ہونا اور آخرا کار ماما عظمت کا رسوایہ کرنا لاجانا

شب برات کے بعد اصغری کے باپ کی آمد شروع ہوئی اور نو دس دن بات کی بات میں گزر گئے۔ رمضان سے چار دن پہلے دور اندیش خان صاحب دہلی میں داخل ہوئے۔ اصغری نے پہلے سے اپنے باپ کی سن رکھی تھی اور ساس اور میاں سے خبر گیا تھا کہ جس دن تحصیل دار صاحب آئیں گے، اسی دن میں ان سے ملنے جاؤں گی۔ جب اصغری کو باپ کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو، فوراً ڈولی منگا جا پہنچیں۔ باپ نے گلے سے گالیا اور آبدیدہ ہوئے۔ دریک حال پوچھتے بتاتے رب اور اصغری سے کہا، آپ کے حکم کے مطابق خیر اندیش خان لاہور گئے ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ کل یا پرسوں سدھی صاحب کو لے کر داخل ہوں گے۔ ان کا ایک خط بھی مجھ کو راد میں ملا تھا سدھی صاحب کو رخصت مل گئی ہے۔ غرض اس رات بھر اور اگلے دن بھر اصغری ماں کے یہاں رہی اور شام کے قریب باپ کو کہا کہ اگر اجازت دیجئے تو آت میں چل جاؤں۔

باپ نے کہا ”اجی ایک ہفتہ تو ہو۔ ہم سدھن کو کہا جیسیں گے۔“

اصغری نے کہا ”جبیما آپ ارشاد فرمائیں، تعمیل کروں۔ لیکن ابا جان کے آنے سے پہلے گھر میں میرا موجود رہنا مصلحت معلوم ہوتا ہے۔“

باپ نے سوچ کر کہا ”ہاں بات تو ٹھیک ہے۔“

غرض اصغری باپ سے رخصت ہو، مغرب سے پہلے گھر آموجود ہوئی۔ اگلے دن کھانے کے وقت مولوی محمد فاضل صاحب (محمد کامل کے باپ) بھی آپنے چھے۔ یہ مولوی صاحب لاہور کے ایک رئیس کی سرکار میں مختار تھے۔ پچاس روپے مہینہ تنخوا و مقرر تھی اور مکان اور سواری رئیس کے ذمے۔ خیر اندیش خان اصغری کی تحریر کے موافق لاہور گیا اور اصغری کا خط مولوی محمد فاضل صاحب کو دکھایا۔ مولوی صاحب بھوکاخط دیکھ کر باش باش ہو گئے اور یوں شاید رخصت نہ بھی لیتے، اب بھوکے دیکھنے کے اشتیاق میں رئیس سے بہت کہہ سن کر ایک مہینے کی رخصت لے کر خیر اندیش خان کے ساتھ ہو لیے۔ پونکہ اصغری بیاہ کے بعد سرے کے نامنے نہیں ہوئی تھی، سرے کو آتا دیکھ کر کوئی پرجا ٹیکھی۔ محمد کامل کی ماں حیرت

میں تھی کہ یہ کیوں کر آگئے! غرض کھانے کے بعد باقی شروع ہوئیں۔ مولوی صاحب نے یوں سے کہا ”سنو صاحب، مجھ کو تمہاری چھوٹی بیوی نے سمجھنے لایا ہے۔“ پھر سب حال خط کا اور خیراند ایش خال کے جانے کا بی بی سے بیان کیا اور کہا کہ بیوہ کو بنا لاؤ۔

سماں کو نہیں پر لگائیں اور کہا ”بیٹی چلو۔ شرم کی کیا بات ہے۔ تم تو ان کی گودوں میں سمجھیں ہو۔“

سماں کے کہنے سے اصغریٰ اٹھ کر ساتھ ہوئی اور سرے کو جھک کر سلام کیا اور ادب سے علیحدہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے کہا ”سنو بھائی، ہم تو صرف تمہارے بانے ہوئے آئے ہیں۔ تمہارا خط دیکھ کر ہمارا جی بہت خوش ہوا۔ خدا تمہاری نمر اور نیک بختی میں بر کرتا ہے۔ حقیقت میں ہمارے گھر کے اچھے نصیب ہیں جو تم ہمارے گھر میں آئیں اور مجھے یقین ہوا کہ اس گھر کے کچھ دن پھرے۔ انشا اللہ تمہاری مرضی اور تمہاری رائے کے موافق سب انتظام کیا جائے گا۔“

غرض دو چار دن تو مولوی صاحب ملنے والے میں رب، پھر اول کے دو چار روز روزے کے سبب گھر کے کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک دن بھوکو بنا کر پاس بھایا اور ماں غلط سے کہا ”ماما ہمارے رہتے سب حساب کتاب کرو۔ جس

جس کو دینا ہے سب اکھادوتا کہ جس کو جتنا مناسب ہو دیا جائے اور جو باقی رہ جائے اس کی قسط بندی کر دی جائے۔“

ماما نے کہا ”ایک کا حساب ہوتا ہے بانی بھی یاد رکھا جائے۔ بنیا، براز، قصائی، کنجڑا، حلوانی، سب ہی کا دینا ہے۔ اور ہزاری مل کا بڑا بھاری حساب الگ ہے۔ جس کو جتنا دینا ہو، مجھ کو دیکھنے لے جا کر آپ کے نام جمع کر دو۔“

مولوی صاحب تو سیدھے سادھے آدمی تھے دینے کو آمادہ ہو گئے۔ اصغریٰ نے کہا ”یوں ٹلی الحساب دینے سے کیا فائدہ؟ پہلے ہر ایک کا قرضہ معلوم ہو، تو اس کو سونت سمجھ کر دینا چاہیے۔“

ماما نے کہا ”کھانے سے فراغت پاؤں تو جا کر ہر ایک سے پوچھا ڈل گی۔“

اصغریٰ: پوچھا نے سے کیا ہو گا؟ جس کو لیما ہو یہاں آ کر حساب کر جائے۔

ماما: یوں آپ نے تو ایک بات کہہ دی۔ اب میں کہاں کہاں باقی پھر دوں، اور وہ لوگ اپنے دہنے سے کب چھٹی پاتے ہیں جو میرے ساتھ چلے آئیں گے؟

اصغریٰ: کوئی روز روز کا بانا نہیں ہے۔ ایک دن کی بات ہے۔ جا کر بنا لاؤ۔ شام کے کھانے کا کچھ بندو بست ہو جائے گا۔ تم آن کام کرو۔ اور لینے والے تو دینے کا نام من کر دو ڈیس گے۔ ہزاری مل تاش کرنے دو دو کوس کچھری پر تو گیا،

یہاں آتے کیا اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہے؟ اور دو کون بے؟ کنجڑا، قصائی، بنیا، حلوانی سب اتنی گلی میں ہیں۔ صرف

براز اور ہزاری مل دور ہیں۔ ان کو کل پر رکھو۔ پہنچنے کل حساب آن طے ہو جائے۔

اما عظمت کی کسی طرح مرضی نہ تھی کہ حساب ہو، لیکن اصغری نے باتوں میں ایسا دبایا کہ کچھ جواب نہ بن پڑا۔ سب سے پہلے حلوانی آیا۔ پوچھا ”اللہ، تمہارا کیا پاہا بے؟“

حلوانی: تمیں روپے۔

پوچھا گیا ”کیا کیا چیز تمہارے بیباں سے آئی؟“ تمیں روپے تو بہت زیاد بتاتے ہو۔“

حلوانی: صاحب تمیں روپے بھی کچھ بہت ہوتے ہیں۔ ایک رقم دس۔ سیر شکر تو اسی شب برات کو آئی۔

محمد کامل کی ماں: ارے! کیسی شکر؟ اب کے مرتبہ ہمارے گھر میں جو کچھ پاک پاک بازار سے نقد آیا۔ یہ سن کر ما عظمت کارنگ فتح ہو گیا اور حلوانی سے بولی ”وہ دس سیر شکر تو نے ان کے حساب میں کیوں لکھ لی؟ وہ تو میں دوسرے کے واسطے لے گئی تھی اور تھجھ کو جتا بھی دیا تھا۔“

حلوانی: مجھ سے تو تم نے کسی گھر کا نام نہیں لیا۔ اسی سرکار کے نام سے لائی ہو۔ ورنہ مجھے کیا فائدہ تھا کہ دوسرے کی چیزان کے نام لکھ لیتا؟ اور مجھ سے تو اور کسی سرکار سے اچاپت بھی نہیں۔

غرض ماکھیانی بتائیں کرنے لگی۔ معاوی صاحب نے کہا ”بھاشکر کی رقم تو رہنے دو۔ اور چیزیں بتاؤ۔“

غرض اسی طرح بہت سی چیزیں اس نے بتائیں جو عمر بھر گھر میں نہیں آئی تھیں۔ چار سیر بالوشاہی معاود شریف کے واسطے اور مزہ یہ کہ بیباں کبھی کسی نے معاود کی مجلس نہیں کی۔ سرف چھ سات روپے تو چھ نکھلے باقی سب جھوٹ۔ معاوی صاحب کا جی جل گیا اور بے طرح ان کو غصہ آیا۔ پوچھا ”کیوں ری نمک حرام عظمت! ایماہی دنیا بھر کا قرض تو نے اس گھر پر کر کھا بے اور یوں تو نے اس گھر کو خاک میں ملا یا بے؟“

حلوانی ہو چکا تو کنجڑا آیا۔ اس نے کہا ”میاں میر احباب تو معمولی بے، دو آنے روز کی ترکاری۔“

محمد کامل کی ماں: ارے! سیر بھر تر کاری میرے گھر میں آتی بے۔ دو آنے روز کی کیسے ہوئی؟“

کنجڑا: حضرت میری دکان سے ما تین سیر لاتی بے۔

ماں: باں تین سیر لاتی ہوں۔ سیر بھر تھمارے نام سے سیر بھرا پنی بیٹی کے واسطے اور سیر بھر دوسرے گھر کے واسطے۔ میں کیا مکرتی ہوں؟ یہ موابیب تھمارے نام بتاتا بے۔

کنجڑا: اری بڑھیا بے ایمان! ہمیشہ سے تو اسی گھر کے حساب میں تین سیر لاتی رہی اور جب روپیہ ملا اسی گھر سے ملا۔

قصائی اور بننے کا حساب ہوا تو اس میں بھی ہزاروں فریب نکھلے اور ثابت ہوا کہ ماما اسی گھر کے سودے میں اپنی بیٹی

خیر اتن اور اپنی دو تین بسائیوں کے گھر پورے کرتی تھی۔ اتنی گھر کے نام سے سودا لاتی اور دوسرا ی جگہ بیٹھ دلتی۔ غرض شام تک پچھلی حساب ہوا اور اب بزاں اور ہزاری مل باقی رہے۔ معاوی صاحب نے کہا ”اب نا وقت ہو گیا بنے۔ آنے ماتوی کرو کل دیکھا جائے گا۔“ لیکن معاوی صاحب نے آہستہ سے یہ بھی کہا کہ ایسا نہ ہو، عظمت بھاگ جائے۔

اصغری: گھر بار اڑ کے بچے مکان چھوڑ کر کہاں بھاگ جائے گی؟ ہاں شاید غیرت مند ہو تو کچھ کھانپی لے۔ مگر ایسی غیرت مند ہوتی تو ایسا کام کیوں کرتی؟ تاہم حفاظت ضرور ہے، لیکن فقط اتنی قدر کہ باہر آتی جاتی کوئی دیکھتا رہے۔ معاوی صاحب کے خدمت گارجو ساتھ آئے تھے، ایک کو چپکے سے کہہ دیا کہما ماؤ آتے جاتے دیکھتے رہو۔ جب کھانے سے فارغ ہوئی، ماپچپکے سے انٹھا باہر چلی۔ خدمت گاڈبے پاؤں پیچھے پیچھے ساتھ ہوا۔ ماپبلے تو اپنے گھر گئی اور وہاں سے کچھ بغل میں مارتیکی طرح سیدھی بزاں کے مکان پر جا کر اس کو آواز دی۔ بزاں گھبرا کر باہر نکلا کہ بڑی بی، تم اس وقت کہاں؟

عظمت: معاوی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ جس جس کا دینا بے سب کا حساب ہوتا ہے۔ کل تم بھی بالائے جاؤ گے تو ایسی بات مت کرنا جس میں میری خصیحت ہو۔

بزاں: حساب میں تمہاری خصیحت کی کیا بات ہے؟

اما: اللہ تم تو جانتے ہو یہ کم بخت لائج بہت رہا ہوتا ہے۔ سرکار کے حساب میں اپنے واسطے بھی تمہاری دکان سے کبھی کبھی اٹھانیں سکھ اور درلیں لے گئی ہوں۔

بزاں: کیا معلوم تم اپنے واسطے کیا لے گئی ہو؟

اما: مجھ کو اس وقت حساب کرنے کا تو ہوش نہیں، لیکن دو چار تھان درلیں اور لیٹھے نیں سکھ کے اور دس گزر اور اقد میرے حساب نکلے گا تو میرے باتھ کی چار چوڑیاں سولہ روپے کی ہیں۔ گھس گھسا کر ایک روپیہ کم ہو گیا ہو گا پندرہ روپے میرے نام سے کم کر دینا اور دو چار روپے جو میرے نام نکلیں گے، میں دینے کو مو جو دہوں۔

بزاں: چوڑیاں تم دیتی ہو۔ خیر، میں لیے تو لیتا ہوں لیکن رات کا وقت ہے۔

عظمت: اس وقت میری عزت تمہارے باتھ ہے۔ جس طرح ہو سکے بچاؤ۔

بزاں سے رخصت ہو سیدھی بزاری مل کے گھر پہنچی۔ وہ بھی جیران ہوا اور بولا کہ تم اس وقت کہاں؟ اس کے پاؤں پر کرو کر کہنے لگی کہ مجھ سے ایک خطاب ہو گئی ہے۔

بزاری مل: وہ کیا؟

عظمت: تم وعدہ کرو معاف کرو دو گے تو میں آبوں۔

ہزاری مل: بات تو کہو۔

عظمت: چار مہینے ہوئے ابھر سے خرق آیا تھا اور مولوی صاحب نے سور و پے تم کو تجھے تھے وہ میرے پاس خرق ہو گئے اور سرکار میں ڈر کے مارے میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اب مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ تم کو حساب کے واسطے طالب کریں گے۔ میں اس روپے کا ٹھکانہ لگا دوں گی۔ تم اس رقم کو ظاہر مت کرنا۔

ہزاری مل: دو چار روپے کی بات ہوتی تو میں چھپا بھی لیتا، اکٹھے سور و پے تو میرے کیے چھپ نہیں سکتے۔

اما: کیا سور و پے کا بھی اقبال نہیں؟

ہزاری مل: صاف بات تو یہ بے کہ تمبارا ایک کوڑی کا بھی اقبال نہیں۔ جس گھر سے تم نے عمر بھر پر ورش پائی، ان ہی کے ساتھ تم نے یہ سلوک کیا تو دوسرا کے ساتھ کب چونکے والی ہو۔

عظمت: باں الہ، جب پر وقت آتا تب تو اپنے دشمن ہو جاتے ہیں۔ خیر، اگر تم کو اقبال نہیں تو اؤیے میری بیٹی کی پہنچاں اور جو شن رکھلو۔

ہزاری مل: یہ معاملے کی بات بے۔ لیکن دن ہو تو مال پر کھا جائے۔ تب معلوم ہو کتنے کاب۔ لیکن انکل سے تو سب مال پچاس ساٹھ کا ہو گا۔

اما: اے بے الہ! ایسا غصب تو مت کرو۔ ابھی چار مہینے ہوئے فو عدہ نوائے تھے۔ سو اسوکی لاگت کے ہیں۔

ہزاری مل: اس میں بر امانت کی بات بے۔ تمباری چیز سوکی ہو یا دوسوکی۔ کوئی نکالے لیتا بے؟ تلوانے سے جتنی خبرے معلوم ہو جائے گا۔

یہ سب بندوبست کر کے ماگھرو اپس آئی۔ مولوی صاحب کے خدمت گارنے پاؤں دبانے میں یہ سب حال مولوی صاحب سے بیان کیا اور محمد کامل کی ماں کے ذریعے سے اصغری کو معلوم ہوا۔ صحیح ہوئی تو بزاں اور ہزاری مل طالب ہوئے۔ حساب میں کچھ جنت ہونے لگی۔ ماچنے ہو چڑھ کر بولتی تھی۔ بزاں نے کہا ”تو بڑھیاڑ کیوں کرتی بے؟ اٹھا اپنی چوڑیاں تو پندرہ روپے کی بتاتی تھی، بازار میں نور و پے کی آنکتے ہیں۔“ ہزاری مل نے پہنچاں اور جو شن سامنے رکھ دیئے اور عظمت سے کہا ”نہیں صاحب، یہ مال ہمارے کام کا نہیں۔“

مولوی صاحب نے بزاں اور ہزاری مل دونوں سے پوچھا ”کیوں بھائی، یہ چیزیں کیسی ہیں؟“ تب دونوں نے رات کی حکایت بیان کی اور عظمت کے منہ پر گویا، لاکھوں جو تیاں پڑھی تھیں۔ جب حساب طے ہو گیا اور مولوی صاحب نے

دینے کو روپیہ نکالا تو جتنا واجب تھا، آدھا آدھا سب کادے دیا اور کہا کہ میں نے اباور سے روپیہ منگایا ہے، دس پانچ دن میں آتا ہے تو باقی بھی دے دیا جائے گا۔ سب لوگوں نے پوچھا کہ ماں کی طرف جو ہمارا نکلا، وہ ہم کس سے لیں؟ یہ بتیں ہو رہی تھیں کہ مسلم مکتب جاتے ہوئے ادھر آنکھا اور یہ بتیں سنتا گیا۔ وہاں جا کر تماشا خانم سے کہا کہ آن تو آپا اصغری کے دروازے پر بڑی بھیڑ جمع ہے۔ ان کے سرے حساب کر رہے ہیں۔ تماشا خانم سننے کے ساتھ ڈولی میں چڑھا پکچی۔ اتری تو اصغری سے گلہ کیا ”کیوں جی، تم نے مجھ کو خبر نہ کی تو کیا ہوا۔“ اصغری: ابھی تو حساب درپیش ہے۔ یہ بھیڑ ہو چکتا تو میں تم کو خبر کرتی۔ غرض مولوی صاحب نے لوگوں سے کہا کہ جو مامے ایسا بے وہ ماما سے اواز نظمت کی طرف متوجہ ہو کر بولے ”حضرت، ان کا روپیہ ادا کرو۔“

عظمت: میں نے سوچا کہ صحیح سے اب تک تو تم پڑھ رہی ہو اب کہاں چولہے میں سر کھپاؤ گی۔
 اصغری: بھلا پیار پر جانے کی بات تو نہ کس غرض سے کہی تھی؟ میں نے تجھ سے صلاح کی تھی یا تو نے مجھ کو کہتے سن تھا؟ اس کا کچھ جواب عظمت کو نہ آیا۔ پھر اصغری نے اشتباہ نکال کر مولوی صاحب کے سامنے ڈال دیا اور کہا ”یکھیسے یہ بیوی عظمت ان گنوں کی ہیں۔ خود تو محلے کے پھاٹک سے اشتباہ رکھاڑا ائی اور خود اماں جان سے کہنے کو دوڑی گئی۔“
 اصغری یہ بتیں کہہ رہی تھی اور مولوی صاحب کا چبرد سرخ ہوتا جاتا تھا۔ ادھر تماشا خامد دانت پیس رہی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا ”تجھ کو نکالنا ہی کافی نہیں۔ تو بڑی بد ذات عورت ہے۔“ یہ کہہ کر اینے خدمت گار کو آواز دی اور کہا ”بپا در،

اس ناپاک کو کتوانی لے جا۔ رفتے میں اس کا سب حال ہم لکھ دیتے ہیں۔“
اصغری نے مولوی صاحب سے کہا کہ بس، اب یہ اپنی سزا کو پہنچ گئی۔ کتوانی سے اس کو معاف رکھیے اور ماما کو اشارہ کیا کہ
”چل دے۔“ بلکہ دروازے تک ماما کے ساتھ گئی۔

غرض مامانظمت اپنے کوتاؤں کے بیچے یہاں سے نکالی گئی۔ گھر پہنچنے تو میں بالا کی طرح لپٹیں میں نہ کہتی تھی اماں ایسی اونٹ
تونہ مچاؤ۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاد کا۔ ایسا نہ ہو کسی دن پکڑی جاؤ۔ تم کسی کی مانگی نہ تھیں۔ خوب ہوا۔ جیسا کیا ویرایہ
پایا۔ اب سرال میں میرا نام تو بد مت کرو۔ جہاں تم بارا خدا لے جائے چلی جاؤ۔ میرے گھر میں تم بارا کام نہیں۔ زیور کو
میں نے صبر کیا۔ لقدر میں ہو گا تو پھر مل رب گا۔“ اس طور پر خدا خدا کر کے اصغری نے اپنے دشمن کو نکال پایا اور گھر کو
عذاب سے نجات دی۔

گھر میں دوسری مامار کھنے کی صلاح

جب عظمت کا فیصلہ ہو گیا تو اصغری نے باپ کے پاس جانے کی پھر اجازت چاہی اور راضی خوش رخصت ہو، ماں کے گھر آئی۔ ایک ہفتہ برابر یہاں رہی اور جس جس بات میں باپ سے صلاح لینی تھی، اطمینان سے پوچھا گھا۔

خان صاحب: عظمت نکل گئی؟

اصغری: سب آپ کے طفیل سے بخیر انجام ہوا۔ نہ بڑے بھائی لا ہور جاتے، نہ باباجان آتے، نہ برسوں کا حساب طے ہوتا، نہ عظمت ہمکی۔

خان صاحب: اب گھر کا انتظام کیوں کر ہوگا؟

اصغری: ماں کے نفے میں تو ادھر پل آئی۔ اب انتظام کیا مشکل ہے۔ اتنی عظمت کی خرابی تھی۔ اب انشاء اللہ میں سب دیکھ بھال اؤں گی۔

خان صاحب: اور کیا کیا باتیں تم نے اس گھر میں ایجاد کیں؟

اصغری: ابھی میں نے کچھ دیکھا بھال انہیں۔ شروع سے عظمت کا جگڑا در پیش آگیا۔ اب البتہ ارادہ ہے کہ ہر ایک کو سوچوں اور انتظام کروں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو خط کے ذریعے اطلاع دیتی رہوں گی۔

خان صاحب نے نکاح کے بعد سے اصغری کا دس روپے کا مہینا مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے اصغری سے پوچھا، ”اگر تم کو تکلیف رہتی ہو تو میں کچھ روپے تتم کو اور دیتا ہوں۔“

اصغری: وہی دس روپے میری ضرورت سے زیادہ ہیں۔ بلکہ آن تک کاروپیہ سب میرے پاس جمع ہے۔ زیادہ لے کر کیا کروں گی۔ جب ضرورت ہو گی تو میں خود مانگ اؤں گی۔

غرض باپ سے اصغری رخصت ہو آئی۔ سرال میں آ کر دیکھا کہ ساس چوبیا پھونک رہی ہیں۔ اصغری نے حیرت سے پوچھا، ”ایں! اب تک کوئی ماننیں رکھی گئی؟“

ساس: آنے کو تو کئی عورتیں آئیں، پر تխواہ سن کر بہت نہیں پڑتی کسی کو نوکر کھنے کی۔ عظمت بری تھی مگر آٹھ آنے مہینے پر پچپس برس اس نے نوکری کی۔ اب جو ماما آتی ہے دوروپے اور کھانے سے کم کاناں نہیں لیتی۔

اصغری: ماں تو ایک میری نظر میں بھی ہے، لیکن تاخواہ دیا دما نگتی ہے۔ غایت النساء کی چھوٹی بہن دیانت النساء پکانا یعنی

سب جانتیں بے اور ایک دفعہ نایت النساء نے بھی کہا تھا کہ کوئی اچھا ملکا نہ ہو تو دیانت النساء نو کری کرنے کو مجبود ہے۔
محمد کامل کی ماں: وہ کیا تխواو لے گی؟

صغریٰ: وہ تو اپنے منہ سے تمیں روپے اور کھانا مانگتی ہے، لیکن تمھانے سے شاید دروڑ پے پر راضی ہو جائے۔

محمد کامل کی ماں: دروڑ پے اور کھانا تادینا ہو تو دروازے پر بھوند و بھیمارے کی بی بی چینا کی ماں منتظر کرتی ہے۔

صغریٰ: چینا کی ماں کتو میں چار آنے پر بھی نہ رکھوں۔

محمد کامل کی ماں: اے کیوں؟

صغریٰ: پاس کا رہنے والا آدمی برآ۔ آنکھ بھی اور جو چیز پاہی گھر میں لے جا کر رکھ آئی اور جب گھر سے گھر ملا بے تو بر گھری چینا کی ماں اپنے گھر جائے گی اور شاید رات کو بھی اپنے گھر رہے۔

محمد کامل کی ماں: بخشوشی بیوی نے اپنی بیٹی زلفن کے واسطے مجھ سے کئی مرتبہ کہا بے۔ زلفن تو سید فیروز کے بیٹے میں رہتی ہے۔

بے۔

صغریٰ: وہی زلفن ہا! جو خوب بنی ٹھنی رہتی ہے؟

محمد کامل کی ماں: بنی ٹھنی کیا رہتی ہے، نہیں بیا ہی ہوئی ہے۔ نئے نئے کپڑے لئے کاڈ راشوق ہے۔

صغریٰ: ایسا آدمی بھی نہیں رکھنا چاہیے۔

محمد کامل کی ماں: خود زلفن کی ماں نو کری کرنے کو راضی ہے۔

صغریٰ: ان کے ساتھ ایک دم چھلا چھوٹی بیٹی کا لگا ہوا بے۔ وہ ایک دم ماں کو نہیں چھوڑتی۔ پس نام تو ایک آدمی کا ہو گا اور کھائیں گے دو دو۔

محمد کامل کی ماں: اور کوئی آدمی میرے خیال میں نہیں آتا۔

صغریٰ: دیکھو اتنی دیانت النساء کو بالا ہوں گی۔

محمد کامل کی ماں: اور تخواو کا کیا ہو گا؟

صغریٰ: ایمان دار آدمی تو کم تخواو پر ملنا محال ہے۔ ان لوگوں کو دو کی جگہ دینے گوارا ہیں لیکن ما عظمت جیسی کو آٹھ آنے والے کر گھر اٹوانا منظور نہیں۔ وہ کہاوت سچ بے، گراں بے حکمت، ارزال بے نلت۔

اس وقت کھانا تو ساس بھونے مل کر پکا پکوالیا۔ کھانے کے بعد اصغریٰ محمود کو ساتھ لے کر کوٹھ پر چل گئی۔ جب تک مواوی صاحب رب، اصغریٰ نے کوٹھ پر سے اترنا بہت کم کر دیا تھا۔ صرف صح و شام نیچے اترتی تھی۔ بلکہ محمود کو بھی منع کر

دیا تھا کہ بے وقت نیچے مت جایا کرو۔ محمود تو اُڑکی تھی، اس نے پوچھا ”اچھی بھابی جان کیوں؟“ اصغری نے کہا ”بڑوں کے سامنے ہر وقت نہیں چلتے پھرتے۔“

گھر کے خرچ کا تعین

کھانے کے بعد گھر کے حساب کتاب میں مواوی صاحب سے اور بی بی سے اٹھائی ہونے لگی۔ بی بی کو شکایت تھی کہ تم خرچ بہت تھوڑا سمجھتے ہو۔ یہاں شادی بیاہ برادری کا لیہا دینا، آنا جانا، تیز تیوپاڑا سب مجھ کو کرنا پڑتا ہے۔ مواوی صاحب کہتے تھے کہ میں روپے مہینا تھوڑا نہیں بے۔ تم کو انتظام کا سلیقہ نہیں۔ اس سبب گھر میں بے برکت رہتی ہے۔ اتنے میں مواوی صاحب نے محمودہ کوآواز دی۔ محمودہ آئی تو کہا ”بھائی کو بala کرو۔“ اصغری نے طلب کی خبر سنی تو حیران ہوئی کہ اس وقت کیوں بala یا۔ محمودہ سے پوچھا ”کیا ہو رہا ہے؟“ محمودہ نے کہا ”اٹھائی ہو رہی ہے۔“ اصغری گئی تو مواوی صاحب نے کہا۔

”کیوں بیٹا، اب انتظام کون کرے گا؟“

اصغری نے کہا ”اماں جان کریں گی جس طرح تک کرتی تھیں۔“

مواوی صاحب نے کہا ”ان کے انتظام کا نتیجہ تو میں نے دیکھ لیا۔ میں روپے مہینا جس گھر میں آتا ہو اس کی بیہی صورت ہوتی ہے کہ نہ سلیقے کا کوئی برتن بئے نہ عزت کی کوئی چیز۔ اگر کسی وقت ایک چھپشہربت درکار ہو تو خدا نے چاہا اس کا سامان بھی گھر میں نہ نکلے گا۔“

اصغری: اماں جان اس میں کیا قصور ہے؟ عظمت نا مراد نے گھر خراب کیا۔

مولوی صاحب: ان میں انتظام کی عتمانی تو عظمت کی کیا طاقت تھی؟ عظمت نو کرتی یا گھر کی مقاتھی؟

اصغری: پچیس برس پر انا آدمی جب اونچے پر کمر باندھتے تو اس کے فریب کو کون جان سکتا ہے؟ ایسے پرانے آدمی پر تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

مواوی صاحب: تم کو آخوندہ بولایا نہ ہوا؟

اصغری: مجھ کو کیا شبہ ہوا، اس نے ناش کا ذکر چھیڑ کر سوئی ہوئی بھڑوں کو جگایا۔

اتنے میں ساس بولیں ”پچاس میں سے تم اپنے اکیلے دم کے واسطے تو میں روپے رکھو اور یہاں کنبے کے واسطے بیس۔“

مواوی صاحب: گھر کا خرچ اور باہر کا خرچ کہیں برابر ہو سکتا ہے؟ تم نے تو مجھ کو کیا سمجھ لیا اور خدمت گار سواری، مکان، کپڑا اتنا؟

بیوی: سواری اور مکان تو سر کار سے ملتا ہے۔

مولوی صاحب: گھوڑا دانہ گھاں تو مجھ کو انی گرد سے کھلانا پڑتا ہے۔ چار روپے کا سائنس اور مکان کی مرمت۔ پھر سر کار در بار کے موافق حیثیت ایما دینا، ہزار بکھیرے ہیں۔ نہیں معلوم میں کس طرح گزران کرتا ہوں۔

صغریٰ نے ساس کی طرف مخاطب ہو کر کہا ”اماں جان بیس روپے میں تکرار کرنے سے فائدہ؟ جتنا ملتا ہے ہزار شکر ہے۔ خدا البا جان کی کمائی میں برکت دے۔ یہ بھی ہزاروں ہیں۔“

ساس: بیٹی مجھ سے تو بیس میں گھر نہیں چلتا۔

صغریٰ نے اشارے سے ساس کو روکا اور مولوی صاحب سے کہا ”آپ چاہے دور روپے اور کم دیجئے لیکن جو کچھ دیجئے، ماں بہ ماہلا کرے۔ جب وقت پر پیسہ پاس نہیں ہوتا تو ناچار قرض ایما پڑتا ہے اور قرض سے گھر کی رہی آہی برکت بھی اڑ جاتی ہے۔“

مولوی صاحب: ہندوستانی سر کاروں میں تجوہیوں کا دستور قاعدہ بہت خراب ہے۔ کبھی چھٹے مہینے تقسیم ہوتی ہے کبھی مرسویں دن ملتی ہے۔ اس سبب سے خرق کا معمول نہیں ہوتا۔ لیکن ہزاری میل سے میں کہہ جاؤں گا کہ ہر مہینے تم کو نہیں روپے دے دیا کرے۔

صغریٰ: مہاں دے جائے گا تو وہ آپ سے سود مانگے گا۔

مولوی صاحب: نہیں سو دیکیا لے گا۔ ہماری سر کار میں بھی اس کا لین دین ہے۔ وہاں سے حکم آجائے گا۔

صغریٰ: ہاں تو اس کا مضائقہ نہیں۔

غرض بیس روپے تجوہ اٹھیر گئی۔ لیکن محمد کامل کی ماں کو گوارہ ہوا اور الگ لے جا کر اصغریٰ سے گلہ کیا۔ اصغریٰ نے کہا ”گھر تو بیس میں انشاء اللہ میں چاچلوں گی۔ اس کا آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ اور مولوی صاحب واقع میں میں روپے سے کم میں اپنی حیثیت درست نہیں رکھ سکتے۔ مختار کی نوکری میں اول تو اوپر سے آمدی کی کوئی صورت نہیں اور ہو بھی تو مولوی صاحب کیوں لینے لگے؟ پس گئی بیٹی پنا شور با۔ مولوی صاحب خود تکلیف میں رہیں اور دو چار روپے گھر میں زیادتی ہو جائے تو مناسب نہیں۔“

یہ سن کر ساس چپ ہو رہیں۔

ما غظمت کی جگہ دیانت النساء رکھی گئی۔

صغریٰ کا انتظام خانہ دار

صغریٰ نے دیانت النساء کو بلا بھیجا اور کبہ سن کر دورو پے اور کھانے پر راضی کر لیا اور جتنا دیا کہ دیانت النساء خبردار! کوئی بات ایسی نہ ہو کہ تمہارے اعتبار میں فرق آئے۔ جس طرح تمہاری بڑی بہن ہمارے گھر رہتی ہے، اسی طرح تم رہنا۔ دیانت النساء نے کہا ”یوی، خدا اس گھری کو موت دے کہ پرانے مال پر نظر کروں۔ ضرورت ہو تو تم سے مانگ کر کھا لوں اور نہ ملتو بھوکی بیٹھی رہوں، پر بے حکم نون تک چکھنا حرام تھھتی ہوں۔“

عید کے اگلے دن مولوی صاحب تو لا ہور سدھارے اور ضرورت کی سب چیزیں اصغریٰ نے کٹھی مٹکوالیں۔ اور آئندہ نہیشہ نصل پر سستی دیکھ کر اکٹھی چیزیں لے رکھتی تھیں مرق، پیاز دھنیا، انان، والیں، چاول، کھانڈ، کھجور، لکڑی، اپلے، سکھانے کی تر کاریاں ہر چیز وقت مناسب پر خرید کی جاتی تھیں ماما لامار کر پانچ آدمی تھے۔ دونوں وقت میں سیر بھر گوشت آتا تھا۔ اس میں دیانت النساء، دو طرح کا کر لیتی تھی۔ کبھی آدھے میں تر کاری اور آدھا سادہ۔ کبھی آدھے میں کباب۔ سامان کے علاوہ دن کو ایک وقت وال، ساتویں دن پالا اور بیٹھے چاولوں کا معمول تھا۔ گھر میں دو تین قسم کی چینی کوئی چاشنی دار، کوئی عرق نعناع کی، کوئی سر کے کی۔ دو چار قسم کا چار مرید بنارکھاں ان کے علاوہ شربت اتار، یہوں کی سکنیجیں، شربت، بخشش، شربت نیلوفر، شربت فالس کی ایک ایک بوتل بنائی۔ ہر طرح کا ضروری سامان گھر میں رہا کرتا تھا۔ باہ جو داس سامان کے پندرہ روپے سے زیاد و خرق نہیں ہوتا تھا۔ پانچ روپے جو بیکتے تھے اس سے بڑے بڑے پھریے اور دس سیرے دو تینی ایک سینی، کچھ چھوٹے چھے، دو لوٹے، ایک عدد چائے کے اوازم، اس قسم کی چیزیں خرید ہوئیں۔ دو صندوق بنوائے گئے۔ الماریاں ایک باورچی خانے میں ایک اسہاب کی کوٹھری میں۔ بیٹھنے کے تخت پرانے تھے، وہ درست ہوئے۔ دو بلنگ تیار ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ اصغریٰ نے اسی بیس روپے میں گھر کو وہ جلا دی کہ ظاہر حال میں بڑی رونق معلوم ہوتی تھی۔ ہر چیز میں نایبت اور انتظام کو دخل دیا۔

غظمت کے وقت میں ہمیشہ محمودہ کے واسطے تین چار پیسے روز کا سودا بازار سے آتا تھا۔ اس واسطے کو کبھی دسترخوان میں ایک مکڑا نہیں بچا۔ اب دونوں وقت دو چار بوٹیاں دسترخوان میں رہنے لگیں۔ کبھی بہنے میں سے دو بوٹیاں محمودہ کے لیے

نکال رہیں۔ کبھی ایک چکنگی کھانڈ نکال دی۔ کبھی مربے کی ایک پھانک دے دی۔ روز کا سو داموقوف ہوا۔ کسی دن کبھی کبھار جو محمود دکا جی چاہاتو کچھ بنگوالیا۔ اس گھر سے فقیر کی عمر بھرا ایک چکن آئیا آدھی روٹنیں ملتی۔ اب دونوں وقت دو دو روٹیاں فقیروں کو بھی دی جانے لگیں۔ گھر میں جو کچھ اسباب تھا، عجیب بد سینگل سے ساگ مولی کی طرح پڑا رہتا تھا۔ اب ہر ایک چیز ٹھکانے لگی۔ کپڑوں کی گٹھڑیاں ہیں تو کپڑے اچھی طرح تہہ کیے ہوئے، ترتیب سے بند ہے ہیں۔ اناٹ پانی کی کوٹھڑی میں ہر ایک ش احتیاط سے ڈھکی ہوئی ہے۔ برتن صاف سترے اپنی جگہ رکھے ہیں۔ چینی کے الگ، تابے کے الگ۔ گویا، گھر ایک کل تھی۔ جب کوک دیا کل اپنی معمول سے چلنے لگی۔ رفتہ رفتہ دو دو چار روپے پس انداز ہونے لگے اور اصغری ان کو بطور امانت عیحدہ جمع کرتی گئی۔ جب سے اصغری نے گھر کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیا، قرض لیا، ختم ہو گیا۔ بھول کر بھی دمڑی چھدام تک کی چیز بازار سے اوہارنہ آئی۔ اصغری گھر کا سب حساب کتاب ایک کتاب میں لکھا کرتی تھی۔ جب کوئی چیز ہو چکنے پر آئی اور دیانت النساء نے اطائیں کی کہ یہوئی دو دن کا اور بے۔ اصغری نے کتاب نکال کر دیکھی کہ کس تاریخ کو کتنا کمی اور کتنے روز کے حساب سے خرچ ہوا۔ اگر بے حساب ہوا تو دیانت سے باز پرس کی۔ مجال نہ تھی کہ کسی چیز میں فضول خرچی ہوا اور بے حساب اٹھ جائے۔ پانی والی کی پانیاں اور دھوبن کی دھلانیاں تک کتاب میں لکھی جاتی تھیں۔

اصغری نے اپنے میاں سے کھیل کو د

چھڑا کر اس کو پڑھنے پر متوجہ کیا

جب ہر ایک چیز کا معمول بندھ گیا اور انتظام بیٹھ گیا، اصغری دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوئی۔ محمد کامل پڑھتا لکھتا تو تھا لیکن ولیمی ہی بے تدبیری اور بے شوقی سے جس طرح آزاد مقام اڑکے پڑھا کرتے ہیں۔ باپ تو باہر رہتے تھے۔ محمد عاقل گوبڑا بھائی تھا لیکن دونوں بھائیوں میں صرف ڈھائی برس کی بڑائی چھٹائی تھی۔ محمد کامل پر اس کا دباؤ کم تھا بلکہ نہیں تھا۔ پس محمد کامل صبح و شام سبق بھی پڑھتا تھا اور ہم عمر اڑکوں میں گنجفہ، شترنج، پوسر کھیلا کرتا تھا۔ بعض مرتبہ کھیل میں مصروف ہوتا تو پہر پہر رات گئے گھر آتا۔ اصغری کو یہ حال معلوم تھا لیکن موتن ڈھونڈتی تھی کہ ایسے ڈھب سے کہنا چاہیے کہ تاگو اخاطرنہ ہو۔ ایک روز محمد کامل بہت رات گئے آیا اور شاید بازی جیت کر آیا تھا۔ خوش تھا۔ آتے کے ساتھ کھانا مانگا۔ دیانت النساء سان گرم کرنے دوڑی۔ محمد کامل سمجھا کہ ایسی پکاری نہ ہے۔ پوچھا ”ماما، بھی تک تمہاری ہندیاں چوہبے سے نہیں اتری؟“

اصغری نے کہا ”کئی دفعہ اتر اتر کر چڑھ چکی بے۔ ایسے وقت تم کھانا کھاتے ہو کہ کھانا ٹھنڈا ہو کر منی ہو جاتا ہے۔ یا ایسا بندوبست کرو کہ سویرے کھا جائیا کرو یا باہر کھانا منگوالیا کرو۔ ادھر تمہارے انتظار میں اماں جان کو ہر روز تکلیف رہتے ہیں۔“

محمد کامل: تم اوگ میرے منتظر رہتے ہو؟ میں تو جانتا تھا کہ تم کھا لیا کرتی ہو گی۔

اصغری: خدار کھے مردوں کے ہوتے عورتوں کو کھانا جھونس بیٹھنا کیا مناسب ہے؟

محمد کامل: دو چار روز کی بات ہوتی تو گزر ہو سکتی ہے۔ آخر میری ہی نارضامندی کا خیال ہے تو میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ تم اوگ کھانا کھا لیا کرو۔

اصغری اس وقت تو چپ ہو رہی۔ کوٹھے پر پھر محمد کامل نے خوب چھیڑ کر اسی بات کو کہا تو اصغری بولی ”تعجب کی بات ہے۔ تم اپنے معمول کے خلاف نہیں کر سکتے اور ہم اوگوں سے چاہتے ہو کہ اپنا معمول توڑ دیں۔ تم ہی سویرے چلے آئے کرو۔“

محمد کامل: کھانے کے بعد باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا اور مجھ کو نیند دیر سے آتی ہے۔ گھر میں بے شغل پڑے پڑے جی

گھبرا تا بے۔ اس واسطے تصدأ دریکر کے آتا ہوں کہ کھانے کے بعد سور ہوں۔

اصغری: شغل تو اپنے اختیار میں ہے۔ آدمی اپنے وقت کو ضبط کر لے تو ہزاروں کام ہیں۔ ایک پڑھنے کا شغل کیا کم ہے۔ میں اپنے بڑے بھائی کو دیکھا کرتی تھی کہ آدھی آدھی رات تک کتاب دیکھتے اور جس دن اتفاق سے سو جاتے تو بڑا انفسوس کیا کرتے تھے۔ تم پڑھنے میں محنت کم کرتے ہو۔ اس واسطے بے شغلی سے تمہارا جی گھبرا تا بے۔

محمد کامل: اور کیا محنت کروں؟ دونوں وقت سبق پڑھ لیتا ہوں اور یاد کر لیتا ہوں۔

اصغری: نہیں معلوم تم کیسا پڑھنا پڑھتے ہو۔ جس دن غذمت کا حساب کتاب ہوا تھا، اب اجان تم سے حساب پوچھتے تھے اور تم بتا نہیں سکتے تھے۔ مجھ کو شرم آتی تھی۔

محمد کامل: حساب دوسرا فن ہے۔ میں عربی پڑھتا ہوں۔ اس سے اور حساب سے کیا واسطہ؟

اصغری: پڑھنا لکھنا اتنی واسطے ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام اٹکانہ رہے۔ بڑے بھائی فارسی بہت پڑھ گئے ہیں، لیکن نوکری نہیں ملتی۔ ابا کہا کرتے ہیں کہ حساب کتاب اور کچھری کا کام جب تک نہ سکھو گے نوکری کا خیال مت کرو۔ اب مآل اندیش مدرسے میں پڑھتا ہے اور حساب کتاب میں بڑے بھائی سے زیادہ ہوشیار ہے۔ ابا اس سے بہت خوش ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ دوسرے مدرسے میں اور پرستھو پھر تم کو کہیں نہ کہیں نوکر کراؤں گا۔

محمد کامل: تو میں بھی مدرسے میں داخل ہو جاؤں؟

اصغری: مدرسے میں داخل ہونے پر کیا منحصر ہے۔ یوں شہر میں سکھانے والے نہیں؟ جتنا وقت تم کھیل میں شائع کرتے ہوئے میں صرف کیا کرو۔

محمد کامل: کھیل کیا میں دن رات کھیلتا ہوں؟ کبھی گھری دو گھنٹے کو بیٹھ گیا۔

اصغری: کھلینا افیون کی تی عادت ہے۔ تھوڑے سے شروع ہو کر بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ لت پڑ جاتی ہے اور پھر اس کا جھونٹا مشکل ہوتا ہے۔ اول تو یہ کھیل گناہ ہیں۔ اس کے علاوہ آدمی کو دوسرے کمال حاصل کرنے سے روکتے ہیں۔ کام کا تک کے آدمی کبھی نہیں کھلتے۔ نکتے اوگ البتہ اسی طرح دن کا تھے ہیں۔ ان کھیلوں میں جیسا بازی ہیتے ہے جی خوش ہوتا ہے، ہارنے سے رنج بھی ہوتا ہے اور جس طرح وہ خوشی بے اصل ہوتی ہے، یہ رنج بھی نا حق ہوتا ہے۔ اور اکثر کھلتے کھلتے آپس میں مفت کی تکرار ہو جاتی ہے۔ میری صلاح مانو تو ان کھیلوں کو بالکل موقوف کرو۔ اوگ تمہارے منہ پر تو کچھ نہیں کہتے لیکن پیچھے ہنستے ہیں۔ پرسوں اترسوں کی بات ہے کہ تم کو کوئی مردو باہا نے آیا تھا۔ ماں نے جواب دیا کہ باہر سدھار گئے ہیں۔ اس مردوئے نے طعنے کے طور پر اپنے ساتھ والے سے کہا، میاں ماسٹر چینی کے مکان پر چلو۔ وہاں

شترن جن کے جگہ میں ملیں گے۔ ابا جان کا شہر میں بڑا نام بے۔ لوگ ان کے معتقد ہیں۔ ایسی جگہ جانے سے آدمی بد نام ہوتا ہے۔ میں نے ابا جان کو افسوس کرتے سننا کہ ہائے ہماری تقدیر! دو لڑکوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوا کہ اس کو دیکھ کر جی خوش ہوتا۔ عاقل کو کچھ لکھایا پڑھایا تھا۔ اب وہ بھی اپنی نوکری کے پیچھے ایسا پڑھا بے لکھا پڑھا بھی بھول گیا۔ یہ چھوٹے صاحب ہیں ان کو کھیل کو دے فرست نہیں۔ بلکہ ہمارے ابا جان کو بھی کسی نے اس کی خبر کر دی۔ مجھ سے پوچھتے تھے۔ میں نے کسی طرح اس وقت بات کوٹاں دیا۔

اصغری کی نصیحت نے محمد کامل پر بہت عمدہ اثر کیا اور اس نے کھلینا با لکل چھوڑ دیا، پسلے کی نسبت عربی پر زیادہ محنت کرنے لگا اور ایک مدرس سے مدرسے کے باہر حساب کتاب بھی سیکھنا شروع کر دیا۔ خدا نے وقت میں بڑی برکت دی ہے۔ اس کو انتظام کے ساتھ صرف کرنے سے چند روز میں محمد کامل کی استعداد عربی بھی درست ہو گئی اور حساب اور ریاضی کی کتابیں بھی نکل گئیں۔

اصغری نے لڑکیوں کا مکتب بٹھایا

محمد کامل تو ادھر مصروف رہا، اصغری نے اسی عرصے میں ایک اور کارخانہ جاری کیا۔ اس محلے میں حکیم روح اللہ خاں بڑے نامی گرامی آدمی تھے۔ حکیم صاحب خود تو سرکار ہمارا راجہ پیالہ میں دیوان تھے لیکن گھر بارا، لڑکے بچے سب اتنی محلے میں تھے۔ مکان، محلاں، نوکریاں کے اکارخانہ تھا، اور یہ گھر شہر کے اوپرے گھروں میں گنا جاتا تھا۔ اوپری جگہ رشتنے والے، اوپرے لوگوں سے رادورسم۔ حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی فتح اللہ خاں بہت مدت تک والشی اندور کی سرکار میں مختار کل رہت اور جب اس سرکار میں منشی عموجان کو بڑا داخل ہوا، مصلحت وقت سمجھ کر کنوار دکش ہو گئے۔ لیکن لاکھوں روپیہ گھر میں تھا۔ نوکری کی کچھ پرواہ نہ تھی۔ ہزاروں روپے کی املاک شہر میں خرید کر لی تھی۔ سینکڑوں روپیہ ماہواری کرائے کا چا آتا تھا۔ بڑی شان سے رہتے تھے۔ ڈیورٹھی پر سپاہیوں کا گارڈ۔ اندر راہر تیس چالیس آدمی نوکر۔ گھوڑا ہاتھی، پاکی، گھمی ہواری کو موجود۔ فتح اللہ خاں کی دو بیٹیاں تھیں، جمال آرا اور حسن آرا۔ جمال آر انواب اسفندر یار خاں کے بیٹے سے بیا ہی گئی تھیں۔ لیکن ایسی ناموافقت ہوئی کہ آخر کار قطع تعلق ہو گیا۔ کچھ خدا نخواستہ طلاق نہیں ہوئی تھی لیکن کسی طرح کا واسطہ باقی نہیں رہا تھا۔ جیزیر کا اسباب تک پھر آیا تھا۔ حسن آرا کی نسبت نواب جنگر کے خاندان میں ہوئی۔ ان لڑکیوں کی خالہ شاد زمانی بیگم اتنی محلے میں رہتی تھی جس میں اصغری کامیکہ تھا۔ اس محلے میں تو اصغری کی لیاقت کا شور تھا۔ شاد زمانی بیگم بھی اصغری کے حال سے خوب واقف تھیں شادی بیاہ میں کئی مرتبہ ان کو دیکھا تھا۔ شاد زمانی بیگم اپنی چھوٹی بہن حسن آرا کی ماں سے ملنے کے لیے آئیں۔ دنیا کا دستور بے کوئی فرد بشر نج سے خالی نہیں اور یہ امر کچھ من جانب اللہ بے اگر ہر طرف سے خوشی ہو تو انسان خدا کو بھول کر بھی یاد نہ کرے اور نہ اپنے تیس بندہ سمجھے۔ شاد زمانی کی چھوٹی بہن سلطانہ کو دنیا کے سب نیش میسر تھے لیکن لڑکیوں کی طرف سے رنجید خاطر رہا کرتی تھیں۔ ادھر جمال آر ایاد برات ہو ہوا کراچی ہوئی گھر بیٹھی تھیں۔ ادھر حسن آرا کے مزان کی افتادا ایسی بری پڑی تھی کہ اپنے گھر ہی میں سب سے بگاڑ تھا۔ نہ ماں کا لالا نہ آپا کا ادب، نہ باپ کا ڈر۔ نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں۔ اونذیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں۔ غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی۔ شاد زمانی بیگم کے آنے سے چاہیے تھا کہ بڑی خالہ سمجھ کر حسن آر گھری دو گھری کو چپ ہو کر بیٹھ جاتی، کیا ذکر! شاد زمانی بیگم کو پاکی سے اترے دیر نہ ہوئی تھی کہ لگاتار دو تین فریادیں آئیں کہ بیگم صاحب دیکھیے چھوٹی صاحب زادی نے میری نئی اور ٹھنی لیر لیر کر ڈالی۔ اب مجھے کون بنایا کر دے گا؟ سماں نے فریاد مچائی کہ بیگم صاحب چھوٹی صاحب

زادی نے میرے گلے میں چکتا بھر لیا۔ گاب بلبا اٹھی کہ بائے! میرا کان خونا خون ہو گیا۔ وائی چائی کر دیکھئے، میری لڑکی کم بخت کے اس زور سے لکڑی ماری کی بازو میں بدھی پڑ گئی۔ باور پچی خانے سے مامنے دبائی دی، اچھی، خدا کے لیے کوئی ان کو سمجھاتا۔ سان کی پتیلوں میں مٹھیاں بھر بھر کر راکھ جموں کر رہی ہیں۔

شادز مانی نیگم نے آواز دی ”حسناً یہاں آؤ۔“

خالہ کی آواز پہچان، بارے حسن آرا چل تو آئی لیکن نہ سلام نہ دعا۔ باتھوں میں راکھ پاؤں میں کچڑ۔ اسی حالت میں دوڑ حالہ سے لپٹ گئی۔ خالہ نے کہا ”حسناً تم بہت شوخی کرنے لگی ہو۔“

حسن آرانے کہا ”اس سنبل چڈیل نے فریاد کی ہو گی۔“ یہ کہہ کر خالہ کی گود سے نکل، اپک کر سنبل کا سر کھوٹ لیا۔ بتیرا خالہ ایس ایس کرتی رہیں، ایک نہ تھی۔

شادز مانی نیگم اپنی بہن کی طرف مخاطب ہو کر بولیں ”بوا سلطانہ، اس لڑکی کے لیے تو خدا کے واسطے کوئی استانی رکھو۔“ سلطانہ نیگم: باجی اماں، کیا کرو؟ مہینوں سے استانی کی تاش میں ہوں کہیں نہیں ملتی۔

شادز مانی نیگم: اوئی بوا۔ تمہاری بھی کہاوت وہی بُت، ڈھونڈ و را شہر میں، پچھل میں۔ خود تمہارے محلے میں مولوی محمد ناضل کی چھوٹی بہو لا کھا استانیوں کی ایک استانی بُت۔

سلطانہ: مجھ کو آن تک اطلاع نہیں۔ دیکھو، میں آدمی بھیجنگتی ہوں۔

یہ کہہ کر اپنے گھر کی داروغہ کو بایا کے مانی جی کوئی مولوی صاحب اس محلے میں رہتے ہیں، باجی اماں کہتی ہیں، ان کی چھوٹی بہو بہت پڑھی لکھی ہیں۔ دیکھو، اگر استانی گیری کی نوکری کریں تو ان کو بلا اؤ۔ کھانا کپڑا اور دس روپیہ مہینا، پان زردے کا خرق، ہم دینے کی حاضر ہیں۔ اور جب اڑکی پہلا سیپاہ ختم کرے گی اور ادب تعاونہ سیکھ جائے گی تو تنخواہ کے عادوں استانی جی کو ہم یوں بھی خوش کر دیں گے۔

مانی جی مولوی صاحب کے گھر آنئیں۔ محمد کامل کی ماں سے صاحب سلامت ہوئی۔ پوچھا ”اچھی بی، مولوی صاحب کی بیوی تم ہی ہو؟“

دیانت النساء: باں یہیں ہیں۔ آؤ بیٹھو۔ کہاں سے آئیں؟

مانی جی: تمہاری چھوٹی بہو کہاں ہیں؟

محمد کامل کی ماں: کوٹھے پر ہیں۔

مانی جی: میں ان کے پاس اوپر جاؤں گی۔

ویانت النساء: آپ اپنا پتہ نشان بتائیے۔ ببو صاحب یہیں آ جائیں گی۔

مانی جی: میں حکیم صاحب کے گھر سے آئی ہوں۔

محمد کامل کی ماں نے نام بنا مسбب چھوٹے بڑوں کی خیر و عافیت پوچھی اور مانی سے کہا ”تمیزدار بہو سے کیا کام ہے؟“
مانی جی: وہی آئیں تو کبھوں۔

تمیزدار بہو کے نیچے اتر نے کا وقت آ گیا تھا، کیونکہ عصر کی نماز پڑھ کر اصغری نیچے اتر آتی تھی اور مغرب اور عشاء دونوں نمازیں پڑھا کرتی تھی۔ اصغری کو مانی جی نے دیکھا تو استانی گیری کی نوکری کے واسطے کہتے ہوئے تامل کیا۔ باتوں ہی باتیں و میں اتنا کہا کہ نیگم صاحب کو اپنی چھوٹی لڑکی کا تعلیم کرانا منظور ہے۔ بڑی نیگم صاحب نے آپ کا ذکر کیا تو نیگم صاحب نے مجھ کو بھیجا۔

اصغری: دونوں نیگم صاحبوں کو میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا جو کچھ بر ابھلا مجھ کو آتا ہے۔ مجھ کو کسی طرح کا عذر نہیں۔ اسی واسطے انسان پڑھتا لکھتا ہے کہ دوسرے کو فائدہ پہنچائے۔ اور بڑی نیگم صاحب کو معلوم ہو گا کہ میں اپنے محلے میں کتنی لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور میرا جی بہت چاہتا ہے کہ نیگم صاحب کی لڑکی کو پڑھاؤں۔ لیکن کیا کروں نہ تو نیگم صاحب لڑکی کو یہاں بھیجیں گی اور نہ ان کے گھر میرا جانا ہو سکتا ہے۔

مانی جی نے تخلواد کا نام نہ لیا لیکن دبی زبان سے اتنا کہا کہ نیگم صاحب ہر طرح سے خرق پات کی ذمے داری کرنے کو موجود ہیں۔

اصغری: یہ سب ان کی مہربانی ہے۔ ان کی ریاست کو یہی بات زیبا ہے لیکن ان کے زیر سایہ ہم غریب بھی پڑے ہیں تو خدا نہ گا بھوکا نہیں رکھتا۔ بن داموں کے اونڈی بن کر خدمت کرنے کو تو میں حاضر ہوں اور اگر تخلواد اور استانی درکار ہو تو شہر میں بہت ملیں گی۔

اس کے بعد مانی جی نے اصغری کا حال پوچھا اور جب سننا کہ تحصیل دار کی بیٹی بے اور موادی صاحب بھی پچاس روپے ماہواری کے نوکر ہیں تو مانی کو نہ امت ہوئی کہ نوکری کا اشارہ نہ حق کیا۔ اصغری کی گفتگو سن کر مانی اٹھ ہو گئی۔ ہر چند کہ نوابی کارخانے دیکھے ہوئے تھے مگر اصغری کی شستہ تقریر سن کر دنگ ہو گئی اور معدہ رت کی کہ بی مجھ کو معاف کرتا۔

اصغری: کیوں تم مجھ کو کانٹوں میں گھستیتی ہو؟ اول تو نوکری اور نوکری بھی حکیم صاحب کے گھر کی، پچھا نیب نہیں، گناہ نہیں۔ اور پھر تراواقفیت کے سبب اگر تم نے پوچھا تو کیا مضا لقہ؟

غرض مانی جی رخصت ہوئیں اور وہاں جا کر کہا ”نیگم صاحب، استانی تو واقعی میں لاکھ استانیوں کی ایک استانی ہے، جس

کی صورت دیکھنے سے آدبو بن جائے۔ پاس بینہنے سے انسانیت لکھئے۔ سایر پڑھانے سے سایقہ لکھئے۔ ہوا لگ جانے سے ادب پکڑے۔ ایکن نوکری کرنے والی نہیں۔ تحریک دار کی بیٹی نہیں۔ رئیس اداہور کے مختار کی بھی۔ گھر میں مامانو کر بے۔ دالاں میں چاندنی پچھلی بے۔ سوزنی گاؤں تکیری لگاتے چھپی خوشگزار ان زندگی بھلاں کو نوکری کی کیا پروابے۔

شادزمانی بولیں ”سچ بے ابو سلطان، تم نے مانی جی کو بھیجا تو تھا لیکن مجھ کو یقین نہ تھا کہ وہ نوکری کریں گی۔“

مانی جی: لیکن وہ تو ایسی آدمی ہیں کہ مفت پڑھانے کو خوش سے راضی ہیں۔

سلطانہ نے پوچھا ”کیا یہاں آ کر؟“

مانی جی: بھلاں نیکم صاحب ہو نوکری کی پرواہ نہیں کرتا وہ یہاں کیوں آنے لگا۔

سلطانہ: کیا پھر اڑ کی وباں جایا کرے گی؟

شادزمانی: اس میں قباحت کی کیا بات بے؟ دو قدم پر تو گھرب اور مواوی صاحب کو تم نے ایسا کیا سمجھا، بھائی علی نقی خان کی ٹکنی پھوپھنی زاد بہن کے بیٹے ہیں۔

سلطانہ: آہا! تو ایک حساب سے ہماری برادری بے۔

شادزمانی: اونخدانہ کرے، کچھا یہے ویسے ہیں۔ پہلے ان کا کام خوب بنا ہوا تھا۔ جب سے رئیس گزار بے چارے غریب ہو گئے۔ پھر بھی ماہمیشہ رہی۔ ڈیورٹھی پر بھی ایک دو آدمی رہتے ہیں۔

سلطانہ: خیر حسن آ راو ہیں چل جایا کرے گی۔

اگلے دن شادزمانی بیگم اور سلطانہ بیگم دونوں بہنیں حسن آ را کوئے کرا صفری کے گھر آئیں۔ باوجود یہ کہ صفری کے یہاں غربتیں سامان تھا لیکن ان کے انتظام اور سایقے کے سب بیگموں کی ودمدارات ہوئی کہ ہر طرح کی چیزوں ہیں بیٹھے موجود ہو گئی۔ دوچار طرح کا عطر، چوگڑا، لاچھی، چکنی ڈالی، چائے۔ بات کی بات میں سب موجود ہو گیا۔ خوب مزے کی گلوریاں تیار ہو گئیں۔ دونوں بہنوں نے صفری سے کہا کہ مہربانی کر کے اس کو دل سے پڑھا دیجئے۔

اصغری: اول تو خود مجھ کو کیا آتا بے، مگر جو چار حرف بزرگوں کی عنایت سے آتے ہیں، انشاء اللہ ان کے بتانے میں اپنے مقدور بھر دریغ نہ کروں گی۔

چلتے ہوئے سلطانہ بیگم اصغری کو اشرافی دیئے گئیں۔

اصغری: اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ میں پڑھوائی آپ سے اوس۔

سلطانہ: استغفار اللہ! پڑھوائی دینے کا ہمارا کیا منہ بے۔ بسم اللہ کی مٹھائی بے۔

اصغری: باں شروع میں تبرک کے طور پر مٹھائی بانٹ دیا کرتے ہیں۔ سوا شرنی کیا ہو گی بچوں کا منہ بٹھا کرنے کو سیر آدھ سیر مٹھائی کافی ہے۔

یہ کبہ کر دیانت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کوٹھڑی میں سے ایک قاب بھر کر نکلیاں نکال لائی۔ اصغری نے خود فاتحہ پڑھ کر پہلے حسن آرا کو دی اور بھری قاب دیانت کو اٹھادی کہ سب بچوں کو بانٹ دو۔
سلطانہ نے کہا ”اچھا تم نے مجھ کو شرمندہ کیا۔“

اصغری: ہم بے چارے غریب کس لاائق ہیں۔ لیکن یہاں جو کچھ بے وہ بھی آپ ہی کا بے۔ البتہ میرا دینا یہی بے کہ حسن آ رائیگیم کو پڑھا دوں۔ سو خدا و دن لائے کہ میں آپ سے سرخرو ہوں۔
غرض دنیا سازی کی باتیں ہو ہوا کر شاذ مانی بیگم چل گئیں اور حسن آرا کو اصغری کے حوالے کر گئیں۔

اصغری کا انتظامِ مکتبی

اصغری نے جس طرز پر حسن آرا کو تعلیم کیا، اس کی ایک کتاب جدا بنائی جائے گی۔ اگر یہاں وہ سب لکھا جاتا تو یہ کتاب بہت بڑھ جاتی۔ اس مقام پر اتنا ہی مطلب ہے کہ حسن آرا کے بینتھے ہی محلے کا محلہ ٹوٹ پڑا۔ جس کو دیکھوائی لڑکی کو لیے چلا آتا ہے۔ لیکن اصغری نے شریف زادیوں کو چین لیا اور باقیوں کو حکمتِ عملی سے ٹال دیا کہ میں آئے دن اپنی ماں کے گھر جاتی رہتی ہوں، پڑھنا پڑھنا جب تک جنم کرنے ہوئے فائدہ ہے۔ پھر بھی بیس لڑکیاں بینتھی تھیں۔ لیکن اصغری کو کسی لڑکی سے لینے اوانے کی قسم تھی۔ بلکہ ایک دور پر یہ اس کا اپنا لڑکیوں پر خرق ہو جاتا تھا۔ صحیح سے دوپہر تک پڑھنا ہوتا ہے اور پھر کھانے کے واسطے چار گلزاری کی چھٹی۔ اس کے بعد لکھنا اور پہر دن رب سے سینا۔ سینے کا کام گنجائش تھا۔ اس واسطے کہ صرف سینا سکھایا جاتا تھا بلکہ ہر طرح کی جالی کاڑھنا، ہر ایک طرح کی سلائی، ہر ایک طرح کی قطع، مصالحہ بنانا اور ناٹکنا۔ اول اول تو اس کا سامان جمع کرنے میں اصغری کے دس روپے خرق ہوئے۔ لیکن پھر تو اسی کام سے بچت ہونے لگی۔ جو کام لڑکیاں کرتیں، دیانت اس کو چیکے سے بازار میں لگا آتی۔

اس طور پر رفتہ رفتہ مکتب کی ایک بڑی رقم جمع ہو گئی۔ جو لڑکی غریب ہوتی، اتنی رقم سے اس کے کپڑے بنائے جاتے۔ کتاب مول لی دی جاتی۔ لڑکیوں کو پانی پلانے اور پنکھا جھلنے کے واسطے خاص ایک عورت نوکر تھی اور مکتب کی رقم سے اس کو تنخواہ ملتی تھی۔ لڑکیوں کا یہ حال تھا کہ اور استانیوں کے پاس جاتے ہوئے ان کا دم فنا ہوتا تھا لیکن اصغری کی شاگردیں اس پر عاشق تھیں۔ ابھی سوکرنیں اٹھی کیڑکیاں خود بخود آنی شروع ہوئیں۔ پھر رات گئے تک جمع رہتی تھیں اور مشکل سے جاتی تھیں۔ اس واسطے کہ اصغری سب کے ساتھ دل سے محبت کرتی تھی۔ اور پڑھانے کا طریقہ ایسا اچھا تھا کہ باتوں باتوں میں تعلیم ہوتی تھی۔ نہ یہ کہ صحیح سے ریس کا چرخہ جو چالا تو دن چھپے تک بند نہیں ہوتا۔ جس طرح اصغری کو اس کے باپ نے پڑھایا تھا۔ اسی طرح اصغری اپنی شاگردوں کو پڑھاتی تھی۔ پس یہ لڑکیاں شاگرد کی شاگردی اور سنبھال کی سنبھال تھیں۔ جب کسی لڑکی کا بیاہ ہوا، مکتب کی رقم سے اس کو تھوڑا بہت زیور پڑھایا جاتا تھا۔

اگر اصغری اپنے مکتب کو بڑھانا چاہتی تو تمام شہر کے مکتب اجڑ جاتے۔ سینکڑوں عورتیں اپنی لڑکیوں کے واسطے خوشامد کرتی تھیں اور خود لڑکیاں دوڑ دوڑ کر آتی تھیں۔ اس واسطے کو وہ مکتبیوں کی دن بھر کی قید، استانیوں کی تختی، پڑھنا کم، مار کھانا، کام کرنا بہت۔ دن بھر پڑھنے تو صرف دو حرف۔ صحیح و شام تو معمولی مار اور جہاں چپ کی اور استانی جی کی نظر پڑگئی؛ آفت

آئی اور کام پوچھو تو صحیح آتے کے ساتھ گھر میں جھاڑو دی۔ استانی جی اور استاد جی اور دس بارہ خلیفہ جی بلکہ پڑوسیوں تک کے پچھو نے تہہ کیے اور چار چار پانچ پانچ نے مل کر کم بخت بھاری بوجھل چار پانیاں اٹھائیں۔ اب پھر دو چار کی شامت آئی تو سی پارہ لے کر بیٹھیں۔ منہ سے آواز نکلی اور استانی جی نے بینیٰ چھینگی شروع کی اور دو چار جو کسی اپنے کامندہ کیا تھیں، کام دھندا ہے میں لگ گئیں۔ کسی نے استانی جی کے لڑکے کو گود میں لیا۔ بو تھکے مارے کولبائٹوٹا جاتا ہے لیکن مار کے ڈر سے گردن پر بالا سوار ہے اور وقت ٹالنی پھرتی ہیں۔ بینیٰ ہوئی لڑکیوں کی آواز برادر کان میں چلی آ رہی ہے۔ اس عذاب سے یہ مصیبت غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے رات کے جھوٹے مرتن مانجھنے شروع کر دیئے ہیں۔ گٹھ پڑ گئے ہیں اور کندھے رو رہ جاتے ہیں لیکن چھوٹی بہن پٹ رہی ہے اور چا رہی ہے ”اچھی استانی جی، میں مر گئی۔ اچھی، میں تم پر داری گئی۔ اچھی خدا کے لیے۔ اچھی رسول کے لیے، اچھی میں خلیفہ جی کی اونڈی ہو گئی۔ ہائے رے! ہائے رے! ہائے رے! اداں!“ ان کاموں سے فراغت پائی تو مصالحہ پینے آٹا گوند ہے، آگ سلاگا نے، گوشت بگھارنے کا وقت آیا۔ پھر دو پہر کو استانی جی کی نظر پڑ گئی آفت آئی۔ اور کام پوچھو تو صحیح تم سبق یاد نہیں کرتیں۔ تمہارے سبب ہمارے مکتب کا نام بد نام ہوتا ہے۔ میں تمہاری اماں جان کو بلا کر کہہ دوں گی کہ بی تمہاری لڑکی یہاں نہیں پڑھتی۔ اس کو تم کسی دوسری استانی کے پاس بھاڑو اتنا کہا کہ لڑکی کا دام فنا ہوا۔ پھر سبق بے کہ نوک زبان پر یاد ہے یا جس نے سبق یاد نہیں کیا، اس سے کہا گیا کہ لڑکیاں دو پہر کو سو نہیں گی اور تم پڑھنا یہ کہنا تھا کہ اس نے جلدی جلدی سبق حظ کیا۔

مکتب میں محمود اور حسن آزادو خلیفہ تھیں۔ نہ یہاں جھاڑو دینی ہے، نہ پچھو نے اٹھانے ہیں، نہ چار پانیاں ڈھونی ہیں، نہ مرتن مانجھنے ہیں، نہ خلیفاً و مکتبہ کو ادا دے پھرنا ہے۔ بلکہ خود لڑکیوں پر ایک عورت نوکر تھی۔ محبت اور آرام۔ پڑھنا، لکھنا، سینا، تین کام۔ خوب شوق سے لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ اس مقام پر مکتب کی ایک دکاءت لکھی جاتی ہے۔ جس سے اصغری کاطرز تعلیم منتظر طور پر معلوم ہو جائے گا۔

انتظامِ مکتب کے متعلق ایک دلچسپ حکایت

سفیہن ایک عورت تھی اور نشیات اس کی بیٹی، کوئی دس برس کی ہو گی۔ اس نشیات کو خود بخوبی پڑھنے لکھنے اور سینے پر ورنے کا شوق تھا۔ سفیہن یہ چاہتی تھی کہ نشیات تمام گھر میں جھاڑو دئے لیپے پوتے، برتن مانجئے۔ لیکن ایسے کاموں میں دل نہ لگتا۔ ماں کے کہنے سے کہ تو دیتی مگر وہی بے دلی بے۔ سفیہن جو ایک دن نشیات پر ناخوش ہوئی تو ساتھ لے جا کر اصغریٰ کے مکتب میں بٹھا آئی اور کہا کہ ”استانی جی یہڑکی بڑی نکمی ہے۔ جس کام کو کہتی ہوں، مکا سا جواب دے دیتی ہے۔ اس کو ایسا ادب دو کہ گھر کے کام پر اس کا جی لگے۔“ اصغریٰ نے جو دیکھا تو نشیات کو اپنے ڈھب کا پایا۔ ادھر نشیات کو انی مرضی کی استانی ملی۔ نور کے ترکے آتی تو دو پہر کو کھانا کھانے جاتی، کھانا کھایا اور پھر بھاگی۔ پانی مکتب میں آ کر پیٹ اور تیسرے پہر کی آئی آئی کہیں چار گھنٹی رات گئے جاتی۔ کبھی کبھی سفیہن اس کی خبر لینے مکتب میں آتی تو کئی دفعہ اس کو لڑکیوں کے ساتھ گھریاں کھلیتے دیکھا۔ دو چار دفعہ ہند کھلیاں پکاتے۔ ایک دن چار گھنٹی رات گئی ہو گئی، نشیات کو جانے میں دیر ہوئی۔ سفیہن اس کو لینے آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ تمود کہانیاں کہہ رہی ہے اور مکتب کی سب لڑکیاں گھیرے ہوئے ہیں اور خود استانی جی بھی لڑکیوں میں نہیں ہوئی کہانیاں سن رہی ہیں۔ تب تو سفیہن کا جی جل کر خاک ہو گیا اور بولی کرو اداستانی جی! اچھا تم نے لڑکیوں کا ناس مار کھا بے۔ جب کبھی میں نشیات کو دیکھنے آئی کبھی میں نے اس کو پڑھتے نہ پایا۔ مکتب کیا بنے، اچھا کھیل خانہ بے۔ تب ہی تو لڑکیاں دوڑ دوڑ کر آتی ہیں۔

سفیہن کی یہ بات سب ہی لڑکیوں کو تا گوار ہوئی اور خصوصاً اس کی بیٹی نشیات کو۔ مگر استانی جی کے ادب سے کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ آخر خود استانی جی نے کہا کہ بوا، اگر تمہاری مرضی کے موافق تمہاری لڑکی کی تعلیم نہیں ہوتی تو تم کو اختیار بنے کہ اپنی لڑکی کو اٹھا لے جاؤ۔ مگر مکتب پر ناقص کا الزام مت لگاؤ۔ بھلا میں تم سے پوچھتی ہوں، نشیات نے مائی جی کے مکتب میں کتنے دنوں پڑھا؟

سفیہن نے کہا ”میراں جی کے چند حصے چاند اس کو بٹھایا تھا۔ مدار بھر پڑھا۔ خوجہ معین الدین بھر پڑھتی رہی۔ مادر جب سے تمہارے ہاں بے۔“

اصغریٰ نے پوچھا ”مائی جی کے ہاں نشیات نے کیا پڑھا؟“

سفیہن نے کہا ”تین مہینے میں والمحسنات کا سی پارہ اور آ دھالا۔ تحکم اللہ۔“

اصغری نے کہا ”تین مہینے میں ڈیڑھ تارہ تو مہینے میں آدھا تارہ ہوا۔ یہاں تمہاری فضیلت ما رجب سے بے اور اب خالی کا چاند چڑھا بے۔ چار مہینے ہوئے و مابروی نفسی کاتی پارہ لکھ تھم ہوا، یعنی سازھے سات تی پارے پڑھے۔ اس حساب سے مہینے پیچھے ایک تی پارے کے قریب ہوتا بے۔ مائی جی کے کتاب سے دوڑا۔ اور جب فضیلت یہاں آئی تو کامی لکیر تو اس کو پیچھی نہیں آتی تھی اب نام لکھ لیتی ہے۔ اور بساط کے موافق حروف بھی برے نہیں ہوتے۔ بیس تک پوری گنتی نہیں جانتی تھی اور اب پندرہ کا پیارا یاد کرتی ہے۔ سینے میں قپچی تک سیدھی بھرنی نہیں آتی تھی۔ اب اس کے ہاتھ کا بخیہ دیکھیو لا یہ عقیلہ ذرا بچھ۔ فضیلت نے جو کرتی میں بخیہ کیا ہے اور ذرا ان کو دکھانا اور فضیلت کے ہاتھ کا لکیری مرمر ابٹیاں لہریا، چھڑیاں، خانہ توڑ دیکھت بھولی، خاکہ تار شمار چینی کا جال، ترپن، نیل، بر ابھلا جیسا کچھ ہو تو وہ بھی اٹھاتی ادا۔“

فضیلت بولی ”استانی جی میں جا کر لے آؤ۔“ یہ کہہ کر دوڑی دوڑی جا پنا کشیدہ اٹھا اٹی۔ سفیمن ایک بات کے دس دل جواب سن کر ہکا بکارو گئی۔

اصغری نے کہا ”بوا بوا۔ کچھ انصاف بھی بے؟ چار مہینے میں تمہاری لڑکی اور کیا سیکھ لیتی۔“

سفیمن تو ایسی شرمندہ ہوئی کہ گھروں پانی پڑ گیا۔ اب استانی جی سے آنکھوں سامنے نہیں کر سکتی تھی۔ سفیمن کم بخت کے آنے سے محمودہ کی مزے کی کہانی تو رہ گئی سب اڑکیاں لگیں اس کی طرف گھور گھور کر دیکھنے۔ سفیمن نے کہا ”استانی جی، مجھ کو اس کی کیا خبر تھی۔ فضیلت دن بھر تو یہاں رہتی ہے۔ رات کو ایسی دریکر کے جاتی ہے کہ کھانا کھایا اور سوئی۔ مجھ کو اس سے پوچھنے کچھنے کا اتنا قاق تو ہوتا نہیں۔ دو پار مرتبہ جو میں اوہر کو آنکھی تو بھی گڑیاں کھیلتے پایا، کبھی ہند کھایا پکاتے، کبھی کہا نیاں سنتے۔ اس سے مجھ کو خیال ہوا کہ یہ اپنا وقت کھیل کو دیں کھوتی ہے۔ اب تو میرے منہ سے بات نکل گئی۔ معاف کیجئے۔“

اصغری: بے شک تمہارا شہر بے جانیں تھا۔ لیکن میں کھیل ہی کھیل میں ان کو کام کی باتیں سکھاتی ہوں۔ ہندیاں کھاہیوں میں اڑکیاں ہر ایک طرح کے کھانے کی ترکیب سمجھتی ہیں۔ مصالحے کا اندازہ نمک کی انکل، ڈاکٹے کی شاخت، بو باس کی پچان ان کو آتی ہے۔ کیوں فضیلت پرسوں جمعہ تھا، تم اڑکیوں نے ملا کر کتنا زر دو پکایا تھا؟ اس کی ترکیب اور حساب کتاب تو ہم کو سناؤ۔

فضیلت نے کہا ”حساب تو محمودہ بیگم نے اپنی کتاب میں لکھ رکھا ہے مگر ترکیب میں نے بوجب آپ کے فرمانے کے خوب دعیان لگا کر دیکھ لی بے اور اچھی طرح سمجھ میں آگئی بے۔ سیر بھر چاول تھے، پبلے ان کو گلن میں بھگو یا۔ شاید دھیلے کی بار سنگھار کی ڈنڈیاں مبنگوائی تھیں۔ پیسے بھر ملی تھیں۔ ان کو کوئی سیر پانی میں جوش دیا۔ جب ابال آگیا اور رنگ کٹ گیا تو

چھان کر عرق میں چاول نچوڑ کر ڈال دیئے۔ چاول ادھ کچرے ہو گئے اور ایک کنی رہی تو چاوالوں کو کپڑے پر پھیلا دیا کہ جتنا پانی بے سب نکل جائے۔ پھر آدھ پاؤ گھنی دیکھی میں اونگوں کا بگھار دے کر کڑکڑا یا اور چاول ڈال دیئے۔ اوپ سے چاوالوں کے ہم وزن کھانہ دی اور انکل سے اتنا پانی ڈال دیا کہ چاول کی جو ایک کنی باقی رہی تھی، گل جائے۔ پھر کوئی ایک چھٹا نک کشش گھنی میں کڑکڑا کر جب پھول گئی، چاوالوں میں ڈال دی اور اوپ تلے انگارے رکھ کر دم دے دیا۔

صغریٰ: ترکیب تو درست ہے۔ لیکن چاوالوں کو جو میں نے دیکھا تو بینہ گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کپڑے پر پھیلا کر ٹھنڈے پانی سے ان کو دھویا نہیں۔ پھر اصغریٰ شفیعین کی طرف مخاطب ہو کر بولی ”کیوں بواز رد تو تمہاری لڑکی نے ٹھیک پکایا؟ یہ سب ہند کہبیا کی بدولت۔ بواحودہ تم اپنے زردے کا حساب تو شاؤ۔“

محمودہ جا حساب کی کتاب اٹھالائی اور کہا ”استانی جی چھیر کے چاول، سیر بھر پونے تین آنے کے اور ایک پیسے کی ڈنڈیاں اور انگوں۔ دو سیر کا گھنی ہے۔ یوں پاؤں بنگوایا پاؤں بگھارتے وقت ڈالا اور چھٹا نک بھر کشش کڑکڑا کر دم دیتے وقت۔ ڈیڑھ آنے کا گھنی ہوا اور چویری کھانہ سیر بھر چاڑا نے کی ایک پیسے کی کشش۔ کل پونے گیارہ آنے کے پیسے خرق ہوئے۔ دس لڑکیوں کا ساجھا تھا۔ پونے دو آنے تو میرے تھے اور نشیات ایک، عقلیہ دو، حسن آرتین، امتۃ اللہ چار عالیہ پانچ، سلمی چھام الغین سات، شکلیہ جبیلہ دونوں بھنیں نو۔ سب کا ایک ایک آنے۔“

صغریٰ: محمودہ تم نے دھو کا کھلایا۔

محمودہ نے سوچا تو کہا ”ہاں استانی جی، چاوالوں میں کوڑیاں بچیں، وہ تاراد بنئے نے ہضم کیں۔ اے بے! ڈنڈیاں اور انگوں ان ہی کوڑیوں میں آ جاتیں تو ایک پیسہ پہتا۔ دیانت جاتو، بنئے سے کوڑیاں مانگ کر لاء۔“

صغریٰ: ایس کیا کرتی ہو؟ کوڑیوں کا معاملہ پرسوں کی بات۔ اب کچھ مت کبو۔ تمہاری نسلطی کی سزا بے کر اتنا نقسان سکو۔ اصغریٰ حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر بولی ”زردے کی ترکیب اور اگت تو معلوم ہوئی۔ بھا دیکھ بھرا۔ سیر بھر زردہ تم نے کیا کیا؟“

حسن آرا: منجوں دو رکابیاں چوٹی دار بھر کر تو اللہ کے نام کی مسجد میں بھیج دیں۔ باقی میں تیرہ طشترياں بھری گئیں۔ مکتب میں ہم سب پچیس لڑکیاں ہیں۔ دو دو میں ایک طشتري آئی، تیرھویں طشتري میں، میں اکیل تھی۔

صغریٰ: کیا تم نے دو ہر حصہ لیا؟

حسن آرا: نہیں تو۔ میری طشتري آدمی ہی تھی۔ سب سے پوچھ لیجئے۔

صغریٰ: تم برادری سے الگ کیوں رہیں؟

حسن آرتو چپ ہوئی، امتہ اللہ نے کہا ”استانی جی ان کو سب کے ساتھ کھاتے گھن آتی ہے۔“

حسن آرا: نہیں استانی جی، گھن کی بات نہیں۔ میں دسترخوان پر سب اڑکیوں سے چیچے آئی۔ اس لیے ایکلی روگئی۔ آپ محمود و نیگم سے دریافت کر لیجئے۔

امتہ اللہ: کیوں، تم ابھی تھوڑی دیر ہوئی میرا جھوٹا پانی پینے پڑا رہیں چکیں؟

حسن آرا: میں اڑی تھی یا صرف اتنی بات کہنی تھی کہ جتنی پیاس ہوا کرے اتنی تدرپانی لیا کرو۔ گا! اس میں جھوٹا پانی جھوڑ دینا نیب کی بات ہے۔

پھر اصغری نے محمود سے پوچھا ”ود رسالہ خوانِ نعمت جو میں نے تم کو دیا تھا، اس سے تم سب کھانے پا کر دیجئے چکیں یا ابھی نہیں؟“

محمود نے تھوڑی دیر تا مل کر کے کہا ”میں اپنی دانست میں سب کپوچکی ہوں بلکہ کئی کئی بار نوبت آچکی ہے۔ جتنی بڑی اڑکیاں ہیں، معمولی روزمرہ کے کھانوں کی ترکیب سب کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہر قسم کے کباب، سسخ کے پندوں کے، شامی گولیوں کے، کونتے، معمولی پاؤ، قورمه پاؤ، کچی بریانی، نور محلی زرد، چنجن، سمو سے یٹھے سلو نے، قائمی بڑے دہی بڑے سہال، سیو، گھنی کی تلی دال، کچوریاں، پاپڑ، بورانی، فیرنی، حلوا، سوتھن، پڑی کائنزرم اندر سے کی گولیاں، سب چیزیں بار بار پک چکی ہیں اور سب اڑکیوں نے پکتے دیکھیں بلکہ اپنے ہاتھوں پکائی ہیں۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے مکتب میں ہند کا ہیا کا تو نام ہے، جو چیز پکتی ہے خاصے ایک کنبے کے لاائق پکتی ہے اور حسن آرا کا تو چینیوں اور مریبوں سے بہت شوق ہے۔ یہ چیزیں ان کے سوائے اور اڑکیاں ذرا کم جانتی ہیں۔“

اس کے بعد اصغری نے سفہیں سے کہا۔ ”بوا، اب تم کو یہاں کی ہند کا ہیا کافا تد و تو معلوم ہو گیا ہوگا۔ رات زیادہ ہو گئی۔“

بعض اڑکیوں کے گھر دور ہیں۔ اگر کل آؤ تو گڑیوں کی سیر تم کو دکھانیں اور شام تک رہو اور کہا نیاں بھی سنوائیں۔“

سب لوگ رخصت ہوئے۔ سفہیں چلتے چلتے اصغری کے آگے با تھہ جوڑ کر کہنے لگی کہ استانی جی اللہ میرا تصور معاف کیجئے گا۔

اگلے روز جو سفہیں آئی تو اڑکیوں کے کاڑھے ہوئے کشیدے اڑکیوں کے بنے ہوئے گوئے اڑکیوں کے موڑے ہوئے گوکھر، اڑکیوں کی بنائی ہوئی تو نیا اور چیبا، اڑکیوں کے قطع کیے ہوئے اور سینے ہوئے مردانے اور زنانے کپڑے اصغری نے سب دکھائے جن کو دیکھنے سے سفہیں کو نہایت اچنچا ہوا۔ اس کے بعد اڑکیوں کی گڑیوں کے گھر دکھائے۔ ان گھروں میں خانہ داری کا سب اواز مہ، فرش فروش، گاؤں تکیے، اگالدان، چلچی، آفتاہ، پتاری، پردا، چلن، چھٹت گیری، پنکھا،

مسہری، ہر طرح کے برتن، ہر طرح کا سامان آرائش اپنے اپنے مکانے سے رکھا ہوا تھا۔ اور گڑیاں ایسی تجھی ہوئی تھیں کہ یہ میں شادی کے لئے مہمان جمع ہیں۔ جب گڑیوں کے گھروں کو دیکھی تو اصغری نے سفہیں سے کہا کہ لڑکیاں کھلیں کھیل میں لگر کا بند و بست، ہر طرح کی تقریبات، چھٹی، دودھ، چھٹائی، کھیر پٹھائی، بسم اللہ روزہ، منانگی، عیدی، سانونی، محرم کی قفلیاں اور گونا، تیز تیز بارسا چین، برسات، بہواز، بیاد، چالے، پوچھی کی رسم سے واقفیت حاصل کرتی ہیں۔ بو سفہیں، تمہاری لڑکی تو بھی تھوڑے دنوں سے آتی ہے، جو لڑکیاں میرے کتب میں بہت دنوں سے ہیں، جیسے یہ نیٹھی ام انھیں یا میری نند محمدودیا حسن آرا، تو بے توبہ کر کے کہتی ہوں کہ اگر ان کو کسی بڑے بھرے پرے گھر کا انتظام اس وقت سونپ دیا جائے تو انشا اللہ ایسا کریں گے جیسے کوئی مشاق اور تجربہ کا رکرتی ہے۔ میں صرف پڑھنے پر تاکید نہیں کرتی، پڑھنے کے علاوہ ان کو دنیا کے کام کا بھی بتاتی ہوں جو چند روز بعد ان کے سر پڑے گا۔

یہ کہہ کر اصغری نے حسن آرا کو بایا اور کہا کہ بوا تمہاری گڑیا کا گھر تو خوب آ راستہ ہے۔ صرف ایک کسر بے کہ تمہاری گڑیوں کے پاس رنگیں بتوڑے نظر نہیں آتے۔ کیا تم کو رنگانہ نہیں آتا؟

حسن آرا: رنگ تو محمود و نیگم نے مجھ کو بہت سے سکھا دیئے ہیں۔ یوں ہی آنکھی کے مار نہیں رنگے۔

اصغری: بھلا بتاؤ تو؟

حسن آرا: استانی جی برسات کے رنگ سرخ، نارنجی، گل، ازار، گل، شفتا اور سروئی، دھانی، روڈا، جازے کے گیندی، جو گیا، عنابی، کاہی، تیلیا، کا کریزی، سیاد، نیلا، گابی، زعفرانی، کوئی، کرنجوی اور گرمی کے پیازی، آبی، چپتی، کپاسی، بادی، کافوری، دودھیا، خشما تی، فاسی، ملا گیری، سیندو ریا۔ رنگ تو بہت ہیں مگر میں نے وہی بیان کیے جو اکثر پہنچتے ہیں۔

اصغری: رنگوں کے نام تو تم نے بہت سے گنوا دیئے، بھلا یہ تو بتاؤ کہ سب رنگ تم کو رنگنے بھی آتے ہیں؟

حسن آرا: میں نے ان رنگوں کے نام لیے ہیں جو مجھ کو خود رنگنے آتے ہیں۔

اصغری: بھلا بتاؤ تو سروئی کیوں کر رفتے ہیں؟

حسن آرا: کاہی قند اچھے گہرے رنگ کی آدھنگز مگوانی اور پانی کو خوب جوش کر کے پھٹکوئی کی ڈلنی اوپر، اوپر سے قند کا مکڑا ڈال کر بلا دیا۔ پھٹکوئی کی تاثیر سے قند کا رنگ کٹ جائے گا۔ بس اس میں کپڑا رنگ لیا۔

اصغری: بھلا قند نہ ملے؟

حسن آرا: تو ٹیسو کے پھلوؤں کو جوش کر کے پھٹکری پیس کر مادی۔ سروئی ہو جائے گا۔ لیکن ہلاکا کپاسی ہو گا۔ اچھا سروئی بے قند نہیں رنگا جاتا اور اگر قند کی جگہ بات کا رنگ کاما جائے تو وہ عدم درنگ آتا ہے کہ سمجھان اللہ! لیکن ان دنوں نجشن ایسا

چاہے کہ سب رنگوں کو مات کیا ہے۔ کپڑے تو کپڑے مٹھائی، کھانے کا گوٹا، مجھن میں نہایت خوش رنگ رنگ جاتا ہے۔
بڑی آپا جان نے مجھن کے رنگ کا زرد و پکا کر بھیجا تھا۔ زعفران سے بہتر رنگ تھا۔

اصغری خانم نے گھبرا کر پوچھا ”حسن آ را کہیں تم نے وہ مجھن کے رنگ ہونے چاول کھائے تو نہیں؟“

حسن آ را: میں نے کھائے تو نہیں۔ لیکن استانی جی، کیوں؟ کچھ بری بات ہے؟

اصغری خانم: اے بے! مجھن میں سکھیا پڑتی ہے۔ خبردار! مجھن کی کوئی چیز زبان پر مت رکھنا۔

حسن آ را: میں نے تو مجھن کا رنگ بوا گوٹا محرم میں بہت کھایا۔

اصغری خانم: کیا ہوا۔ رفق برادر مجھن میں تو بہتر اگوٹا رنگ جاتا ہے۔ اس سبب سے تم کو کچھ نقصان نہ ہوا۔ لیکن یاد رکھو کہ اس میں زہربے۔

حسن آ را: مجھن کی رنگی ہوئی مٹھائی لوگ منوں کھاتے ہیں۔

اصغری خانم: بہت را اکرتے ہیں۔ زہربے اپنی مقدار پر پہنچ جائے گا، ضرور اڑ کرے گا۔

شام ہوئی تو اڑکیاں اپنے اپنے کشیدے اور کتا میں رکھ معمول کے مطابق کھینے اور کہانیاں اور پہنیاں کہنے سننے کو آئیں۔ اصغری نے سفیہن سے کہا کہ یہاں چنے کے چنیا کی کہانیاں نہیں ہوتیں۔ کہانیوں کی ایک بہت عمدہ کتاب ہے، منتخب الحکایات، جس میں بڑی اچھی اچھی کہانیاں ہیں اور ہر ایک کہانی ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ اب یہ اڑکیاں اسی کتاب کی کہانیوں سے جی بہانیں گی۔ کہانیاں کہنے سے ان کی تقریر صاف ہوتی ہے۔ ادائے مطلب کی استعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور جب کبھی مجھ کو فرصت ہوتی ہے تو میں کہانیوں کے پتھر پتھر میں ان سے الجھن جاتی ہوں اور جیسی ان کی سمجھتے ہیں میری بات کا جواب دیتی ہیں۔ اگر نادرست ہوتا ہے، میں بتاویتی ہوں۔ پہنیوں کے بو جھنے سے ان کی عتمل کوتر قی اور ان کے ذہنوں کو تیزی ہوتی ہے۔ لیکن تم ان میں بیٹھ کر سیر دیکھو۔ مجھ کو آن عالیہ کی ماں نے بالا بھیجا ہے۔ ان کے بچے کا جی اچھا نہیں۔ بہت بہت سفیہن کہا بھیجی ہیں۔ نہ جاؤں گی تو بر امامیں گی اور میرا جی نہیں مانتا۔

سفیہن: باں میں نے بھی سنا ہے کہ ان کے اڑکے نے کئی دن سے دودھ نہیں پیا۔ بے چاری بہت ہر سال ہورہی ہیں۔ اے بے! خدا کرے نگوڑا جیتا رہے۔ بڑی اللہ آمین کا بچہ ہے۔ وہ برس پھر ک پھر کر خدا نے یہ صورت دکھائی ہے۔ عالیہ کے اوپر یہی تو ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ استانی جی، تم کو عان کے واسطے بایا ہو گا۔

اصغری: عان ولان تو مجھ کو کچھ بھی نہیں آتا۔ ایک مرتبہ پہلے اسی اڑکے کو پیاس ہو گئی تھی۔ میں نے زہر مہرہ نسلو چن، گاب کا زیرا، چھوٹی الاصنی، زیرے کی گری، کباب، چینی، خرد، اسی طرح کی دوچار دو ائمیں بتاویتی تھیں۔ خدا کا

کرنا، اڑکا اچھا ہو گیا۔

غیہن: استانی جی، تم تو ماشاء اللہ اچھی خاصی حکیم بھی ہو۔

صغریٰ: اجی اللہ اللہ کرو۔ حکیموں کا درجہ تو بہت بڑا ہے۔ میں بے چاری کیا حکیمی کروں گی۔ پر بات یہ ہے کہ ہمارے میکے میں دو اور مرن کا بہت خیال ہے۔ جب میں چھوٹی تھی، جو دو آتی، میں ہی اس کو چھانتی بتاتی اور خیال رکھتی۔ اتنی طرح پرسنی سنائی دو چار دوائیں یاد ہیں۔ جس کو ضرورت ہوئی بتا دی۔ اور بچوں کا مانن تو عورتیں ہی کر لیا کرتی ہیں۔ جب مشکل آپریتی بہت تو حکیم کے پاس لے جاتے ہیں۔

غیہن: استانی جی، تم نے مہربانی کر کے مجھ کو اپنے مکتب کا سب انتظام تو دکھایا۔ اللہ ڈرادم کے دم تھبیر جاؤ تو میں دیکھ لوں کر لیاں کیوں کر کہ بانیاں کہتی ہیں اور کہانیوں میں کیوں کرم تعلیم کرتی ہو۔

صغریٰ: بوا، مجھ کو تو دیر ہوتی ہے پر خیر، تمہاری خاطر ہے۔ اچھا اڑکیوں آن کس کی باری ہے؟

محمودوہ: باری تو امتۃ اللہ کی ہے لیکن غذیات سے کہا لائیے۔

صغریٰ: اچھا غذیات جس کتاب میں سے تمہارا جی چاہے، جلدی سے کوئی بہت چھوٹی سی کہانی پڑھو۔
غذیات نے کہانی شروع کی کہ ایک تھا بادشاہ۔۔۔۔۔۔

صغریٰ: بادشاہ کس کو کہتے ہیں؟

غذیات: جیسے دہلی میں بہادر شاہ تھے۔

صغریٰ: یہ تو تم نے ایسی بات کہی کہ جو دہلی اور بہادر شاہ کو جانتا ہو وہ ہی صحیح ہے۔

غذیات: بادشاہ کہتے ہیں حاکم کو۔

صغریٰ: تو کتوال تھانے دار بھی بادشاہ ہیں؟

غذیات: نہیں۔ کتوال تھانے دار تو بادشاہ نہیں ہیں۔ یہ تو بادشاہ کے نوکر ہیں۔

صغریٰ: کیوں؟ کیا کتوال حاکم نہیں ہے؟

غذیات: حاکم تو بے لیکن بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہوتا ہے اور سب پر حکم چاہتا ہے۔

صغریٰ: ہمارا بادشاہ کون ہے؟

غذیات: جب سے بہادر شاہ کو انگریز پکڑ کر کا لے پانی لے گئے، تب سے تو کوئی بادشاہ نہیں۔ یہ سن کر سب اڑکیاں ہنس پڑیں۔

اصغریٰ: فضیلت تم بڑی نادان ہو۔ تم نے خود کہا کہ جو سب سے بڑا حاکم ہو اور سب پر حکم چائے، وہ بادشاہ ہوتا ہے!
اور یہ بھی جانتی ہو کہ بہادر شاہ کو انگریز پکڑ کر کالے پانی لے گئے تو انگریز بادشاہ ہوئے یا نہ ہوئے؟

فضیلت: ہائے ہوئے تو ہی۔

اصغریٰ: اچھا اب بتاؤ ہمارا بادشاہ کون ہے؟

فضیلت: انگریز۔

اصغریٰ: کیا انگریز کسی خاص شخص کا نام ہے؟

فضیلت: نہیں۔ یہ تکڑوں بزراروں انگریز ہیں۔

اصغریٰ: کیا سب انگریز بادشاہ ہیں؟

فضیلت: اور کیا۔

یہ سن کر پھر لڑکیاں بنس پڑیں۔

اصغریٰ نے حسن آر کی طرف اشارہ کیا کہ تم جواب دو۔

حسن آر: استانی جی ہمارا بادشاہ ملکہ و کٹور یہ ہے۔

اصغریٰ: مرد یا عورت۔

حسن آر: عورت ہے۔

اصغریٰ: کہاں رہتی ہیں؟

حسن آر: لندن میں۔

اصغریٰ: لندن کہاں ہے؟

حسن آر: انگریزوں کی ولایت میں ایک بہت بڑا شہر ہے۔

اصغریٰ: کتنی دور ہو گا؟

حسن آر: میں نے ایک کتاب میں چار بزرار کوں لکھا دیکھا ہے؟

اصغریٰ: کوں کتنا لمبا ہوتا ہے؟

حسن آر: استانی جی، سلطان نظام کو تین کوں کہتے ہیں۔

یہ سن کر محمودہ بلسی اور کہا ۲۰۷۱ اگر کہا ہوتا ہے۔

اصغری نے محمودہ سے پوچھا کہ اس مرتبہ جو میں قطب صاحب گئی تھی اور تم بھی میرے ساتھ تھیں، تم نے دیکھا ہو گا کہ یہاں سے جاتیوں کو بانیں با تھے، فاسلے سے سڑک پر پتھر گڑے تھے اور ان پتھروں پر کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔ بھلا وہ پتھر کیسے تھے؟

محمودہ: میں انگل سے یہی تھی کہ کوسوں کے پتھر ہیں۔ لیکن گاڑی ایسی تیز تھی کہ پتھروں پر لگاؤ نہیں جاتی تھی۔ میں خوب نہیں پڑھ سکی کہ ان پر کیا لکھا تھا۔

اصغری: وہ کوسوں کے پتھرنہیں تھے، میلوں کے پتھر تھے۔ آدھے کوں کامیل ہوتا ہے۔ ہر میل پر پتھر گڑا ہے۔ اس میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ یہاں سے دہلی اس قدر میل بے اور قطب صاحب اتنے میل۔ اس کے بعد اصغری پتھر حسن آرا کی طرف مخاطب ہوئی اور پوچھا ”باں بوا“ ندن کس طرف ہے؟“

حسن آرا: اتر میں ہے۔

اصغری: وہ ملک گرم ہے یا سرد؟

حسن آرا: یتو میں نہیں جانتی۔

محمودہ: بڑا سرد ہے۔ جتنا اتر کو جاؤ اگر کم ہوتی جاتی ہے اور جتنا دکھن کو چلوگرمی زیاد ہوتی جاتی ہے۔

شفیعیں: اچھی استانی جی، عورت بادشاہ ہے؟

اصغری: اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

شفیعیں: تعجب کی بات کیوں نہیں؟ عورت ذات کیا کرتی ہو گی؟

اصغری: جو مرد بادشاہ کرتے ہیں، ہو عورت کرتی ہے۔ ملک کا بندوبست رعیت کا پالنا۔

شفیعیں: عورت تو کیا خاک کرتی ہو گی، کرتے تو سب کچھ انگریز ہوں گے۔ برائے نام عورت کو بادشاہ بنارکھا ہو گا۔

اصغری: یہ سب انگریز ملکہ کے نوکر ہیں۔ ہر ایک کا کام الگ ہے ہر ایک اختیار جداب۔ اپنے اپنے کام پر سب مستعد رہتے ہیں۔ اور جب مرد بادشاہ ہوتے ہیں تب بھی اکیلے بادشاہ ساری دنیا کو اٹھا کر اپنے سر پر نہیں رکھ لیا کرتے۔ نوکر چاکر ہی سب کام کرتے ہیں۔

شفیعیں: میرا جی تو قبول نہیں کرتا کہ عورت ذات بادشاہت کر سکے۔

اصغری: تم نے بھوپال کی بیگم کا نام بھی سنابے؟

سفیہن: کیوں، سنا کیوں نہیں؟ خود میرے سرے بھوپال میں نوکر ہیں۔

اصغری: بس، اس طرح سمجھو۔ بھوپال ذرا سالمک بے اور ملکہ و کٹوریہ کے پاس بڑی سلطنت تھے۔ جس طرح بھوپال کی بیگم اپنے چھوٹے ملک کا بندوبست کرتی ہیں، ملکہ و کٹوریہ اپنی بڑی سلطنت کا انتظام کرتی ہیں۔ بھوپال چھوٹی سرکار بے نوکر چاکر کم ہیں اور تھوڑی تخلوہ اپاتے ہیں۔ ملکہ و کٹوریہ کی سرکار بڑی عالی جاہ سرکار بے۔ بڑے کارخانے، لاکھوں نوکر تخلوہ اپاتے ہیں قرار۔

سفیہن: اچھی، ملکہ کا کوئی میاں بے؟

اصغری: باں گرموت پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ چاند کو بھی خدا نے داش لگا دیا ہے۔ کئی برس ہوئے ملکہ قبود ہو گئیں۔

سفیہن: ملکہ کی کوئی اولاد بے؟

اصغری: باں خدار کھے بیٹھے پوتے، بیٹیاں، نواسیاں سب کچھ بے۔

سفیہن: اچھی، ملکہ اس ملک میں کیوں نہیں آتیں؟

اصغری: وہاں بھی بڑا ملک بے۔ وہاں کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ اور بادشاہوں کا اپنی جگہ سے بنا ایسی کیا آسان بات بے؟ لیکن ان دونوں ان کا مختحلا جیتا آنے والا بے۔ بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں نے اخبار میں دیکھا ہے۔

سفیہن: اچھی، ملکہ کو ہزاروں کوں دور بیٹھے یہاں کی خبر ہوتی ہوگی؟

اصغری: کیوں نہیں۔ ذرا ذرا خبر ہوتی بے۔ ڈاک برقی پر رات دن خبریں آتی جاتی ہیں۔ ہزاروں اخبار و لایت جاتے ہیں۔

سفیہن: ملکہ کو کیوں کر دیکھیں؟

اصغری: کیوں کرتاؤں؟ لیکن ان کی تصویر البتہ دیکھ سکتی ہو۔

سفیہن: خیر، تصویر ہی دیکھ لیتے۔

اصغری: بواتم بھی تماشے کی باتیں کرتی ہو۔ کیا تم نے روپیہ دیکھا ہے۔

سفیہن: کیوں نہیں دیکھا۔

اصغری: عورت کا چہرہ جو بنا بے وہ ملکہ کی تصویر ہے۔ خطوں کے نٹوں پر ملکہ کی تصویر ہے۔ اور میرے پاس ملکہ کی بڑی عمدہ تصویر ہے۔ میرے ابا کو کسی انگریز نے دی تھی۔ وہ انہوں نے میرے پاس بھیج دی تھی۔ محمود ذری میرا صندوق تھے تو اٹھا لااؤ۔

صد و پچھے میں اصغری نے ملکہ کی تصویر نکال کر دکھائی اور سب لوگوں نے نہایت شوق سے ملکہ کی تصویر دیکھی۔

شفیعین: کیا اچھی تصویر ہے! میں میں ملکہ لھڑی ہیں۔ بس بولنے کی دیر ہے۔

اصغری: بے شک یہ تصویر ہو بیو ملکہ کی ہے۔ روپے کے چہرے سے ملا کر دیکھو کتنا فرق ہے۔ یہ تصویر ہاتھ کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ ایک آئینہ ہوتا ہے۔ اس کو مصالحہ لگا کر سامنے رکھ دیتے ہیں، خود بخود جیسے کاتیساں کس اتر آتا ہے۔

شفیعین: ملکہ کی صورت تو بہت ہی پاکیزہ ہے۔

اصغری: اب صورت کی پاکیزگی کو کیا دیکھتی ہو۔ ایک تو عمر، دوسرا ہے بیوگی کا رنج۔ اور سب سے بڑھ کر ملک داری کے ترددات۔ پہاں میں نے ملکہ کی اس وقت کی تصویر دیکھی تھی جب ان کا نیانیا بیاد ہوا تھا۔ با مبالغہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔

شفیعین: کیوں استانی جی، ملکہ کے بیٹے ہیں تو باپ کے مرنے پر بڑا بیٹا تخت پر کیوں نہ بیٹھا؟

اصغری: یہ تخت ملکہ کے شوہر کا نہیں بلکہ ملکہ نے اپنے چچا سے پایا ہے۔ اور ملکہ نے تخت نشین ہونے کے بہت دنوں بعد اپنا بیاد کیا۔

شفیعین: باں تو یوں کہو کہ ملکہ کے شوہر بادشاہ نہ تھے۔

اصغری: نہیں، نہیں۔ مگر وہ شاہی خاندان سے تھے۔

شفیعین: مجھ تک رد کریں خیال آتا ہے کہ عورت سے ملک کا بندوبست کیا ہوتا ہو گا۔

اصغری: تم کیسی انعام اور ایسا یعنی باتیں کرتی ہو! تم نے ملک کو اپنی جیسی یا میری جیسی عورت سمجھ رکھا ہے۔ اس سے تم کو تعجب ہوتا ہے۔ لیکن بیوی بنو خدا جن کے رتبے بڑے کرتا ہے، ویسا ہی حوصلہ اور ویسی ہی عقیل بھی ان کو دیتا ہے۔ نہ سب مرد یکساں اور نہ سب عورتیں یکساں۔ ہم کو اس کا کیا سوچ پڑ گیا کہ ملکہ اپنی عقیل سے ملک کا بندوبست کرتی ہیں، جیسا کہ تم شبہ کرتی ہو۔ ہم کو تو بس اتنا کرتا ہے کہ ملکہ کی عمل داری میں (خدا ان کو سلامت رکھے) ان چیزوں سے بیٹھے ہیں۔ کسی طرح کا زور نہیں، خلم نہیں، بھینت نہیں، بیگار نہیں، اوت نہیں، کھوٹ نہیں، مار نہیں، دھاڑ نہیں، اڑائی نہیں، جگڑا نہیں۔ تم کو اس عمل داری کی جب قدر آئے کہ کسی دوسری عمل داری میں جا کر رہو۔ اور گئی تو میں بھی نہیں اور خدا نہ لے جائے، لیکن تاریخ کی کتابوں میں دیکھتی ہوں، اخبار پڑھتی ہوں۔ بعض ظالم بادشاہوں نے لوگوں کو ایسا ستایاب کر کہ ان کے حالات دیکھ کر کیا جب تھر تھر کا پنے لگتا ہے۔ اور اب بھی دنیا میں سبھی طرح کے بادشاہ ہیں۔ لیکن خلق خدا کو جیسا آرام ہماری و کثری یہ کی عمل داری ہے، روئے زمین پر کہیں نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ملکہ یہاں ہمارے پاس رہتی ہو تو ہم لوگوں کو ان کی ذات سے بہت

فائدے پہنچتے۔ پھر بھی میں نے تحقیق ناہب کر جب یہاں کی رعایا کی ذرا سی تکلیف بھی سن پاتی ہیں تو ان کا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اور ملکہ کی رحم دلی اور خدا ترسی کی حکایتیں جو کبھی بھی اخبار میں نظر سے گزری ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شک ان کو لوگوں کی پرداخت کا بہت بڑا خیال ہے اور تسبیحی ہوں کہ ہونہ ہو ملکہ نے اپنے بیٹے کو بھی اسی غرض سے بھیجا ہے کہ اپنی آنکھوں سے رعایت کا حال دیکھو اور مجھ سے آ کر کہو۔

شیخیں: ملکہ کے بیٹے کب تک آنے والے ہیں؟

صغریٰ: ابھی روانگی کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی۔ مگر آنا تھبہر پکا بہ۔ میں تسبیحی ہوں اصل خیر سے شاید ڈیڑھ دو مہینے میں داخل ہو جائیں گے۔

شیخیں: یہاں دلی بھی آئیں گے؟

صغریٰ: ضرور۔ تمام ہندوستان میں پھریں گے۔ دلی تو بڑا مشہور شہر ہے۔ سینکڑوں برس تک مسلمان بادشاہوں کا دارالسلطنت رہا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہاں نہ آئیں۔

شیخیں: ہم کو کیا، ہماری طرف سے آئے نہ آئے دونوں برابر۔ ہم ان کو دیکھ سکتے ہی نہیں۔

صغریٰ: اور دیکھی سکتیں تو کیا کرتیں؟ آنے دو۔ میں ان کی تصویر بھی تم کو دکھاؤں گی۔

شیخیں: استانی جی، اگر ملکہ کے بیٹے کی تصویر تمہارے پاس بتوابھی دکھادو۔

صغریٰ: میرے پاس بے بھی نہیں اور میں نے دیکھی بھی نہیں۔ مگر بابا گلکتے کے دربار میں جانے والے ہیں۔ انہوں نے مجھ کو لکھا ہے کہ بن پڑا تو تمام شاہی خاندان کے لوگوں کی تصویریں تمہارے لیے لاوں گا۔

شیخیں: حسن آرائے لندن کو چار ہزار کوں بتایا تو کہیں برسوں میں یہاں سے وہاں تک آتے جاتے ہوں گے۔

صغریٰ: نہیں۔ سمندر سمندر ایک مہینے میں با فراغت پہنچ جاتے ہیں۔

شیخیں: اے بے! سمندر ہو کر جانا پڑتا ہے۔ نون! انگریزوں کے بھی کیسے دل ہیں۔ ان کو سمندر سے ڈر نہیں گلتا؟ میرے تو سمندر کا نام سننے سے روکنگے کھڑے ہوتے ہیں۔

صغریٰ: سمندر سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟ مزے میں جہاز میں بیٹھ لے۔ اچھا خاصا خانہ رواں بن گیا۔

شیخیں: اے بے! استانی جی۔ ڈوبنے کا کیسا بڑا اکٹھا ہے۔ اپار سال کی بات ہے۔ نواب قطب الدین خان کے ساتھ میر کی خیالی ساس حج کو گئی تھیں۔ کچھ ایسی گھڑی کی گئیں کہ پھر اوت کر آنا نصیب نہیں ہوا۔

صغریٰ خانم: بابا، اتنا قل کی بات ہے۔ جہاز کبھی کبھار ڈوب بھی جاتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ آئے دن ڈوبا کریں تو سفر

دریائی کا کوئی نام نہ لے۔ اب تو دریا کا راستہ ذکر کوں سے زیادہ آباد ہور بابے۔ ہزاروں لاکھوں جہاز رات دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ انگریز اور ان کے بیوی بچے اور کل انگریزی اسہاب سب جہاز کی راہ پیاس آتا ہے۔
سفیہن: انگریزوں کی عورتوں کا کیا ذکر، اور ہماری ان کی کیا لیس وہ تو باہر پڑی پھر تیاں ہیں۔ سنتی ہوں، نئے بچوں کو ولایت بھیج دیتی ہیں اور ان کا دل نہیں کرہتا۔ نہیں معلوم کس قسم کی مائنیں ہیں۔ کیوں کران کے دل کو صبر آتا ہے۔ پھر باہر کی پھر نے والیاں اور پھر کے کھجے۔ ان کو ایک مندر کیا، ہوا پر اڑتا بھی مشکل نہیں۔

اصغری خانم: باہر کے پھرنے کی جو تم نے کہن تو ان کے ملک میں پردے کا دستور نہیں۔ ندر کے دنوں میں ہم اونکا گاؤں میں بھاگ کر گئے تھے۔ وہاں بھی پردے کا دستور نہ تھا۔ سب کی بہو بیٹیاں باہر ہٹتی تھیں۔ لیکن میں تو چار مہینے وہاں رہی۔ باہر کی پھر نے والیوں میں ولناڑ دیکھا کہ خدا ہم سب پردے والیوں کو نعییب کرے۔ اور بچوں کو ولایت بھیج دینے سے تم کیوں کر سمجھیں کہ اولاد کی محبت نہیں؟ البتہ ان لوگوں کی محبت عقل کے ساتھ ہے۔ یہاں کی ماڈل کی طرح باولی محبت نہیں کہ اولاد کو پڑھنے سے روکیں، بنر حاصل کرنے سے باز رکھیں۔ نام کو تو محبت اور حقیقت میں اولاد کے حق میں کاٹنے بوتی ہیں۔ اولاد کو نہ ہموار اٹھاتی جاتی ہیں اور محبت کا نام بد نام کرتی ہیں۔

یہاں پہنچ کر سب نے سکوت کیا اور فضیلت نے اپنی کہانی پھر شروع کی: اس بادشاہ کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ ایک ایک بیٹی تھی۔ بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ میرے بعد یہی اڑکی وارث سلطنت ہو گی، اس اڑکی کو خوب پڑھایا اور لکھوایا اور ملک داری کا قانون تقدیر سب اچھی طرح سکھایا اور اپنے جیتے جی۔ اسی کو ملک کا کام سونپ دیا۔ فضیلت یہاں تک پہنچتی ہے کہ اصغری خانم نے کہا ”بواتم جھپ جھپ کہانی کہتی جاتی ہو اور میرے دل میں پوچھنے کی بزراروں با تین بھری ہیں۔ پر کیا کروں دن تو ہو پکنے پر آیا اور مجھ کو عالیہ کے گھر جانا ضرور ہے۔ شام کے وقت کسی کے گھر عیادت کو جانا بھی منع ہے۔ میں تو اب نہیں ٹھہر سکتی۔ تم اڑکیاں آپس میں کہو سنو۔“ اور سفیہن سے کہا ”او بوا۔ اللہ بیان میں تو جاتی ہوں۔ تمہارا دل چاہے تو تم بیٹھیں رہو یا کل پھر آ جانا۔ یہاں تو روز بھی ہوا کرتا ہے۔“

غرض اصغری خانم تو عالیہ کے گھر روانہ ہوئیں اور سفیہن ایسی تکھیں کہ پھر رات تک لڑکیوں میں بیٹھی رہ گئیں۔ اصغری خانم کے پیچے محمود اور حسن آ رانے کہانی کے پیچے پیچے میں خوب خوب مزے کی با تین نکالیں۔

اس بیان سے اصغری کے مكتب کا انتظام اور اس کی تعلیم اور تلقین کا طریقہ بخوبی ظاہر ہے۔ اصغری بے شک حسن آ را کو بہت چاہتی تھی اور اس سے زیادا اپنی نند محمود کو۔ حسن آ را کو اس خوبی سے پڑھایا کہ دو ہی برس میں اچھی خاصی طرح بے تکلف اردو لکھ پڑھتی تھی۔ نہ اگلی تی بدمزاجی باقی رہی نہ پہلا ساچہ چڑا پن۔ بڑی غریب، لکھی پڑھی، بہر مند، بوشیار نیک

پیاری بیٹی بن گئی۔ جمال آرا کا برسوں کا اجزہ ابواً گھر اصغریٰ کی بدولت خدا نے پھر آباد کیا۔ لیکن یہ تمام قصہ دوسری کتاب میں لکھا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ حکیم جی کا تمام گھر، چھوٹے بڑے اصغریٰ کے پاؤں دھوندھوکر پیتے تھے۔ سلطانہ نیگم نے لاکھ لاکھ حتن کیتے کہ اصغریٰ کچھ لے مگر اس خدا کی بندی نے اپنی آن نتوڑی۔ جب حسن آرا کا بیاہ ہونے لگا تو بڑے حکیم صاحب نے مولوی محمد فاضل کا دباؤ ڈال کر اصغریٰ کو ہزار روپے کے جزا و کڑے دیئے اور کہا ”سنو۔ تم میری پوتی اور نواسیوں کے برادر ہو۔ میں تم کو استانی گیری کی رو سے نہیں دیتا بلکہ اپنا بچہ سمجھ کر دیتا ہوں۔ اور نہ لوگی تو مجھ کو خست مال ہو گا۔“ ادھر مولوی صاحب نے سمجھایا تو اصغریٰ نے کڑے لے لیے۔

اصغری اپنے میاں کو نوکری کے رستے پر لگاتی ہے

ادھر تو اصغری اپنے مکتب میں مصروف تھی، ادھر محمد کامل بے روزگاری سے گھبرا تھا۔ ایک دن اصغری سے کہنے لگا ”اب میرا دل بہت گھبرا تا بنے۔ اگر تمہاری صلاح ہوتو میں تخلیل دار صاحب کے پاس پیاڑ پر چا جاؤں اور ان کے ذریعے سے نوکری تباش کروں۔“

اصغری نے تھوڑی دیرتا مل کر کے کہا کہ نوکری کرنی تو بہت ضرور ہے۔ اس واسطے کہ تم دیکھتے ہو کیسی بیکھر سے گھر میں گزر ہوتی ہے۔ ابا جان اب بڑھے ہوئے۔ منا سب یہ بے کوہ گھر بیٹھیں اور تم کما کران کی خدمت کرو۔ عاً وہ اس کے محمودہ بڑی ہوتی جاتی ہے۔ میں اس کی منگنی کی فکر میں ہوں۔ اور خدار اس لائے تو ارادہ یہ ہے کہ بہت اوپھی جگہ اس کا بیاہ ہو اور میں تدبیر کر رہی ہوں۔ انشاء اللہ اتنی برس اس کی بات تھہری جاتی ہے لیکن اس کے واسطے بڑا سامان درکار ہو گا اور اس وقت تک کسی قسم کی کوئی چیز موجود نہیں۔ بھائی جان اول تو الگ ہیں اور پھری ایسی تھوڑی نوکری میں ان کی براواتات نہیں ہو سکتی دوسرے کو کہاں دے سکتے ہیں۔ بس سوائے اس کے کہ تم نوکری کرو اور کوئی صورت نہیں۔ لیکن پیاڑ پر جانے کی میری صلاح نہیں۔ اب تو تمہارے واسطے کوشش کریں گے اور غالب بے کے جلد تر تم کو چھپی نوکری مل جائے گی۔ لیکن کسی کا سہارا پکڑ کر نوکری کرنا کچھ ٹھیک تی بات نہیں۔ باہم تھوڑی ہوئی پر اپنے قوت بازو سے ہو۔ گوابا کوئی غیر نہیں ہیں۔ رشتے میں بھی تم سے ان کا باتھاونچا بے۔ ان سے لینا کیا بلکہ مانگنا بھی نہیں۔ پھر بھی خدا کسی کا احسان مند نہ کرے۔ سدا کو آنکھ جھک جاتی ہے۔ انہوں نے مدد پر نہ رکھا تو اللہ رکھ کئے میں سوآدمی ہیں زود رُونہ کہیں گے تو پیٹھے پیچھے ضرور کہیں گے کہ دیکھو سرے کے سہارے نوکر ہو گئے۔

محمد کامل: پھر کیا کروں؟ لا ہو رچا جاؤں؟

اصغری: لا ہو رہا میں کیا دھرا بے؟ رئیس کی سرکار خود بتاہ بے۔ ابا جان کو بھی نہیں معلوم، پہلے کالجاظ ماں کروہ کس طرح پچاہ روپے دیتا بے۔ نئے آدمی کی گنجائش اس کی سرکار میں کہاں؟

محمد کامل: اور بہت سرکاریں ہیں۔

اصغری: جب سے انگریزی عمل داری ہوئی، سب رئیس اتنی طرح بتاہ ہیں۔ پچھلے نام نمود کو بنابتے ہیں۔ اس سے دس پانچ صورتیں ان کے یہاں لگی لپٹی رہتی ہیں۔ سو وہ بھی کیا خاک، ارسوں تختوں اور نہیں ملتی۔

محمد کامل: پھر کیا غلط بے؟

اصغری: انگریزی نوکری تلاش کرو۔

محمد کامل: انگریزی نوکری تو بے سی سفارش کے نہیں ملتی۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مجھ سے بہتر بہتر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

اصغری: ہاں سچ بے لیکن جب آدمی کسی بات کا ارادہ کرے تو خدا اپرتوکل کر کے نامیدی کا تصور ذہن میں نہ آنے دے۔ ماہا کہ ہزاروں نوکری کی جستجو میں لا حاصل پھرتے ہیں لیکن جو نوکر ہیں وہ بھی تو تم ہی جیسے آدمی ہیں۔ اور سو بات کی ایک بات تو یہ بے کو نوکری تقدیر سے ملتی ہے۔ بڑے بڑے لائق دیکھتے کہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اور خدا کو دینا منظور ہوتا ہے تو نہ وسیلہ بے نہ لیاقت۔ چیپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ گھر سے باکر نوکر رکھ لیتے ہیں۔

محمد کامل: تو عرض یہ بے کہ گھر بیٹھا رہوں۔

اصغری: یہ ہرگز میرا مطلب نہیں۔ جہاں تک اپنے سے ہو سکے ضرور کوشش کرنی پائیے۔

محمد کامل: یہی تو مشکل بے کہ کیا کوشش کروں؟

اصغری: جو لوگ نوکری پیشہ ہیں ان سے ملاقات پیدا کرو۔ ان سے محبت بڑھاؤ۔ ان کے ذریعے سے تم کو نوکری کی خبر لگتی رہے گی اور ان ہی کے ذریعے سے تم کسی حاکم تک بھی پہنچ جاؤ گے۔

محمد کامل نے یہیں کیا کہ نوکری پیشہ لوگوں سے ملاقات کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ سر رشتہ دار، تحصیل دار ایسے لوگوں میں بھی آنے جانے لگا۔ روز کے آنے جانے سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی نوکری کی جستجو ہے۔ یہاں تک کہ بندہ نلی بیگ نے جو پکھری میں اظہار نو لیں تھے، محمد کامل سے کہا کہ میاں نوکری کی تلاش بے تو میرے ساتھ پکھری چاکرو۔ چندے امیدواری کرو۔ سر رشتہ کے کام سے واقفیت بہم پہنچاؤ۔ حاکموں کو صورت دکھاؤ۔ اتنی طرح کبھی ڈھب لگ جائے گا۔ محمد کامل پکھری جانے اور بندہ نلی بیگ کے ساتھ کام کرنے لگا۔ یہاں تک کہ حاکم سے دستخط کرالاتا۔ حاکم لوگ اس کو جانتے پہچانتے لگے۔ کسی عملے کو رخصت کی ضرورت ہوئی وہ آدھی تباہی تھی اور پراس کو عوسمی دے گئے۔ یہاں تک کہ اتفاق سے ایک دس روپے مہینے کا روزانہ مچنے نو لیں تین مہینے کی رخصت پر گیا تھا۔ تین مہینے بعد اس نے استغفاری بحث دیا اور مولوی محمد کامل صاحب اس کی جگہ مستعمل ہو گئے۔ کبھی کبھی اصغری سے نوکری کا تذکرہ ہوتا تو محمد کامل خوارت کے ساتھ کہا کہ تھا کہ کیا واہیات نوکری ہے۔ دن بھر پیسنا اور دس روپی۔ نہ اپر سے کچھ پیدا بنتے نہ آئندہ کو ترقی کی امید۔ میں تو اس کو چھوڑ دوں گا۔ اصغری بیشہ ایسے خیالات پر ملامت کرتی کہ خخت درجے کی ناشکری تم کرتے ہو۔ وہ دن بھول گئے کہ امیدواری بھی

لھیب نہ تھی یا ب پر سر کارہ تو قد رہیں کرتے۔ گھر کے گھر میں دس روپے کیا کم ہیں۔ اپنے بڑے بھائی کو دیکھو کہ کئی برس تک سو داگر کے یہاں دس روپے کی نوکری کرتے رہے۔ اور جب تم نوکری سے ایسے دلبرداشتہ ہو، تم سے کام بھی خاک ہوتا ہو گا۔ آخر کو نوکری چھوٹ جائے گی۔ اور اسی طرح تھوڑے سے بہت بھی ہوتا ہے۔ ہمارے ابا پبلے آٹھ روپے مہینے کے نقل نویں تھے۔ اب خدا کے نصل سے تحسیدار ہیں۔ اور خدا نے چاہاتو اور بھی بڑھیں گے۔ اوپر کی آمدی پر کبھی بھول کر بھی نظر مت کرنا۔ حرام کے مال میں ہرگز برکت نہیں ہوتی۔ تقدیر سے بڑھ کر مل نہیں سکتا۔ پھر آدمی کیوں نیت کوڈ انواں ڈول کرے۔ اگر اس سے زیادہ ملنے والا ہے تو خدا حال سے بھی دے سکتا ہے۔

صغریٰ کے سمجھانے سے محمد کامل

پر دلیں کو نکالا اور ترقی پائی

غرض اصغریٰ ہیش محمد کامل کو سمجھاتی رہتی تھی۔ بیہاں تک کہ جس حاکم کے پاس محمد کامل نوکر تھا اس کی بدلتی سیالاکوٹ ہوئی۔ یہ حاکم محمد کامل پر بہت مہربانی کرتا تھا۔ دن کو پچھری میں یہ حال معلوم ہوا۔ شام کو محمد کامل گھر آیا تو بہت افسردا خاطر تھا۔ اصغریٰ نے پوچھا ”خیریت؟ آن کیوں اداں ہو؟“

محمد کامل: کیا بتاؤں۔ جیس صاحب کی بدلتی سیالاکوٹ کو ہو گئی بے۔ وہی تو ایک مہربان حال تھے۔ اب پچھری میں رہنے کا مطاق مزدہ نہیں۔

اصغریٰ نے بہت دیر سکوت کیا۔ پھر کہا ”بے شک جیس صاحب کا بدل جانا افسوس کی بات ہے۔ لیکن ناس قدر کر جتنا تم کو بے۔ دوسرا جوان کی جگہ آئے گا، خدا اس کے دل میں رحم ڈال دے گا۔ آدمی کو آدمی پر بھروسہ نہیں رکھنا چاہیے۔“ پھر اصغریٰ نے پوچھا۔ ”جیس صاحب کب جائیں گے؟“

محمد کامل: کل شام ڈال میں سوار ہو جائیں گے۔

اصغریٰ: تم ان کے بنگلے پر نہیں گئے؟

محمد کامل: اب کیا جاتا۔

اصغریٰ: واو! یہی تو ملے کا وقت ہے۔ کچھ نہ ہو گا تو کوئی چھٹی پروانہ تم کو دے جائیں گے۔ اور پھر ذرا دل میں سوچو۔ ایسے وقت اپنے مرتبی اپنے محسن سے آنکھیں چپانا بڑی بے مردوں کی بات ہے۔

محمد کامل: یہ جو میں نے کہا کہ اب کیا جانا، سوق کے مارے میرے منہ سے نکل گیا اور نہ ممکن نہیں کہ میں اور جیس صاحب سے نہ لاؤں۔ اچھا، صحیح کو ضرور جاؤں گا۔

بہت سویرے کپڑے پہن محمد کامل جیس صاحب کے بنگلے پر گیا۔ جیس صاحب نے کہا ”محمد کامل سیالاکوٹ جاتا ہے اور ہم تم سے بہت راضی تھا۔ تم چاہے تو ہمارے ساتھ سیالاکوٹ چلے۔ ہم تم کو وہاں نوکری دے گا۔ نہیں اپنے پاس سے پندرہ روپے دے گا۔“

محمد کامل نے سوچ کر کہا "اس کا جواب میں حضور کو پھر حاضر ہو کر دوں گا۔ اپنی والدہ سے پوچھاؤں۔"

غرض محمد کامل گھر اوث آیا تو ذکر کیا کہ جیس صاحب مجھ کو ساتھ لیے جاتے ہیں۔ محمد کامل کی ماں نے سنتے ہی غل مچایا۔

صغری بھی سنائے میں ہو گئی۔ آخر محمد کامل نے پوچھا "صاحب ہبتا ڈی میں جا کر کیا جواب دوں؟"

محمد کامل کی ماں بولیں "جواب کیا دینا بے۔ اب کیا دتیرے لیے بیٹھا رہن گایا تیرے لیے سپاہی صحیح رہا بے؟"

محمد کامل: نہیں بی۔ میں اس سے وعدہ کر آیا ہوں۔ اپنے جی میں کہے گا، ہندوستانی کیسے خود غرض مطلی ہوتے ہیں۔ چلتے وقت ہم سے جھوٹ بولا۔

محمد کامل کی ماں: اچھا تو جا کر کہہ آؤ صاحب میرا جانا نہیں ہو سکتا۔

محمد کامل نے اصغری سے پوچھا "کیوں صاحب تمہاری کیا صلاح ہے؟"

صغری: صلاح اور ہوتی ہے اور دل کی خواہش اور ہوتی ہے۔ دل کی خواہش تو یہ تھی کہ تم یہاں رہو۔ گھر کا انتظام صرف تمہارے دم سے ہے۔ آخر گھر میں کوئی مرد بھی چاہتے ہے۔ اور صلاح پوچھو تو جانا مناسب ہے۔ جب ایک حاکم خود بے کہے تم کو ساتھ لے جاتا ہے تو ضرور اپنی جگہ پہنچ کر بہت سلوک کرے گا۔

محمد کامل: پانچ روپے کے واسطے کیا دو تین سو کوں کا سفر۔ میرا دل تو جانے کو نہیں چاہتا۔ وہ مثل ہے، گھر کی آدمی نہ باہر کی ساری۔

صغری: یوں تم کو اختیار ہے لیکن ایسا موقع تقدیر سے ملا ہے۔ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ اور سفر کوں نہیں کرتا۔ ہمارے ابا، تمہارے ابا، دیکھو ان لوگوں نے اپنی تیریں سفر میں تیر کر دیں۔ اور بالفعل پانچ سن لیے گئے، پیچھے دیکھو گے کتنے پانچ۔ اور اگر نہیں جاتے تو پھر دس روپے سے بے دلی مت ظاہر کرتا۔

محمد کامل: تو یہاں کی نوکری کو استغفار دے جاؤں؟ اور فرض کیا کہ وہاں کچھ صورت نہ ہوئی تو ادھر سے بھی گیا اور ادھر سے بھی گیا۔

صغری: اول تو یہ فرض کرنا کہ وہاں کچھ صورت نہ نکلے گی، خلافِ عقل ہے۔ جیس صاحب اتنا بڑا حاکم ہے اور تم کو کام دینا چاہے اور صورت نہ نکلے؟ میری سمجھ میں تو نہیں آتا اور پھر استغفار کیوں، ممینے کی رخصت اور۔

محمد کامل: باں، رخصت منظور ہوئی پڑی ہے۔

صغری: منظور ہونے کو کیا ہوا؟ اسی جیس صاحب سے کہو۔ چھٹی لکھ دے گا۔

غرض اصغری نے زبردستی جوہت کر محمد کامل کو جانے پر راضی کیا۔ اپنے پاس سے پچاس روپے نقد دینے اور چھے جوڑے

نئے کپڑے بنوادیئے۔ دیانت کے بینے رفیق کو ساتھ کر دیا۔ مولوی محمد کامل سیالکوٹ چلے گئے۔ ادھر اصغری نے مولوی محمد ناضل صاحب کو یہ تمام حال خط میں لکھا اور یہ بھی لکھ دیا کہ جیس صاحب سیالکوٹ جاتے ہوئے ضرور اماہور ہو کر جائیں گے۔ اگر ایسا ہو سکے۔ کہ آپ وہاں ان سے ملاقات کر کے ان کی سفارش کچھ رئیس سے کر دیں تو بہت مفید ہو گا۔ مولوی صاحب نے جیس صاحب کی جستجو کی۔ رئیس کے کچھ دیبات ضلع سیالکوٹ میں بھی تھے۔ مولوی صاحب نے رئیس کی طرف سے دعوت کی اور رئیس کے باش میں تھبہ ریا۔ کھانے کے بعد صاحب اور رئیس دونوں بیٹھے ہوئے باقیں کر رہے تھے کہ مولوی صاحب سے کہا ”دبلی کی رعایا کو آپ کی مفارقت کا بہت تلق ب۔ اگر چہ آپ صرف دو ہی رس دبلی میں حاکم رب ہیں لیکن آپ کے انصاف آپ کی شرفا پروری سے وہاں کے لوگ بہت خوش تھے۔ ایک بندہ زادہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس کے لکھنے سے سب حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔“

صاحب نے پوچھا ”کیا آپ کا کوئی لڑکا بھی میری کچھری میں تھا؟“

مولوی صاحب نے کہا ”محمد کامل۔“

صاحب نے کہا ”وہ تو ہمارے ساتھ آیا بے۔ وہ آپ کا بیٹا بے؟“

مولوی صاحب نے کہا ”آپ کا غلام بے۔“

رئیس نے اس تقریب میں صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب ہماری ریاست کے قدیم الخدمت ہیں اور ہم کو ہر طرح سے ان کی پرداخت لمحوظ خاطر رہتی ہے۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں، اب گنجائش نہیں۔ پس اگر آپ ان کے بینے کی پروردش فرمائیں گے تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔

جیس صاحب پہلے سے محمد کامل کے حال پر مانتت تھا۔ ایسے وقت مناسب پر تقریب ہو گئی کہ صاحب کو بہت خیال ہو گیا۔ اول تو جوان نو عمر، دوسرا شریف، تیسرا رئیس کا سفارشی، چوتھے خود صاحب کا آور دہ پانچویں لاک۔ اتنے حقوق محمد کامل کو حاصل ہو گئے۔ صاحب نے پہلے دن کچھری کرتے ہی محمد کامل کو پچاس روپے کا نائب سرنشتہ دار کیا اور مولوی محمد فاضل صاحب کو خط لکھا کہ بالفعل ہم نے آپ کے بینے کو پچاس روپے کی نوکری دی بے اور ہم جلد اس کی ترقی کریں گے۔ آپ رئیس کی خدمت میں اطاعت کر دیجئے۔

مولوی صاحب نے اپر ز مناسب صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ محمد کامل جو کبھی امیدواری کا ممتاز تھا، پھر چھوٹے چھوٹے عبدے داروں کی عوضیاں کرتا، پھر صرف دس روپے کا روزنا مچ نو لیں تھا، پھر پندرہ روپے کے وعدے پر وہ بھی اصغری کے جو تھے سے جیس صاحب کے ساتھ سیالکوٹ آیا تھا، اب ایک دم سے پچاس روپے کا عبدے دار ہو گیا۔ محمد

کامل کی ماں اگر چہ جاتے وقت نوش تھیں، پچاس کا نام سن کر ان کی باچپنی کھل گئیں۔ اب تو گھر میں چوٹی برکت ہو گئی۔
اصغری کا انتظام اور بیس کی جگہ اب چالیس روپے مہینا گھر میں آنے لگا۔ پھر کیا پوچھنا!

محمد کامل کی آوارگی۔ اصغری نے جا کر اس کی اصلاح کی اور جاتے وقت بہن اور بہنوئی کو گھر میں بسا گئی

محمد کامل آخر میں ایک ہی برس میں سر رشتہ دار ہو گیا۔ لیکن سر رشتہ دار ہونے تک سن بجا ہوا تھا۔ خرق بھی بر امیر آتا تھا۔ خط بھی متواتر آتے تھے۔ لیکن آدمی تھا جوان۔ خود مختار ہو کر صحبت بری مل گئی۔ بہک چا۔ خطوں میں کمی ہونی شروع ہوئی۔ اصغری بڑی و انش مند تھی۔ سمجھ گئی کہ دال میں کالا بے۔ بہت دن تک فکر میں رہی کہ اب کیا تم پیر کروں۔ آخر سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ خود جانا چاہیے۔ بر چند اصغری نے سیالکوٹ جانے کا عزم معمم کر لیا تھا۔ لیکن تماشا خانم کو اصلاح کے واسطے بلا بھیجا اور سب حال اس سے کبا۔

تماشاخانم: بوا، کوئی دیوانی ہوئی بے؟ شہر چھوڑ کر اب کہاں سیالکوٹ جاتی پھرے گی۔

اسفرا: مجھ کو شہر سے کیا مطلب؟ تو جس کے ساتھ وابستہ ہوں ویسی شہر بنے۔

تماشاخانم: اے بے! کنبے والے کیا کہیں گے؟ ہمارے کنبے میں آن تک کوئی باہر نہیں گیا۔

اسفرا: اس میں عیب کی کیا بات ہے؟ آخر میں یہی کہیں گے کہ میاں کے پاس چل گئی تو بر اکیا کیا؟ اور کنبے کی جو پوچھو تو پچھلے دنوں نہ ڈاک تھی نہ ریلی نہ رستے آباد تھے عورتوں کا سفر کرتا۔ بہت مشکل تھا اس سبب سے لوگ نہیں جاتے تھے۔ اب اگر آن ڈاک میں ہمیشہ اور خدا حاصل خیر رکھتے تو پسون سیالکوٹ داخل۔ گویا میر ٹھگئی۔

تماشاخانم: کیا طبع کا خط آیا بے؟

اسفرا: خط تو نہیں آیا۔

تماشاخانم: بن بالائے جانا تو مناسب نہیں۔

اسفرا: تم منا سب نا منا سب دیکھتی ہو اور میں کہتی ہوں اگر نہ جاؤں گی تو عمر بھر کو گھر غارت ہو جائے گا۔

تماشاخانم: اے آپا! تم ایسی کیوں گری پڑتی ہو؟ تم کو ان کی کیا پرواہ بے۔ خدا تمبارے کتاب کو سلامت رکھے۔ تم دل کو روٹی کھلایا کرو۔

اسفرا: وادا! آپ کی بھی کیا سمجھ بے ایہ کتاب تو میں نے اپنا جی بہلنے کے واسطے بیالا بے۔ چھم جھ کو اس سے کمائی کرتا

منظور نہیں۔ خدا جانے تم کو یقین آئے یا نہ آئے، آن تک میں نے مکتب کی رقم میں سے ایک پیسہ اپنے اوپر خرق نہیں کیا۔ صرف پچاس روپے لفڑا اور بیس روپے پکڑے کے واسطے تمہارے بھائی جان کو سیال کوٹ جاتے ہوئے ضرور دیتے تھے۔ سو وہ بھی قرض داخل اور باقی کوڑی کوڑی کا حساب موجو دے دیجے لو۔ عورتوں کی کمائی بھی کوئی کمائی نہ۔ اگر عورتوں کی کمائی سے گھر چاکریں تو مرد کیوں ہوں؟ میرا اپنا گھر بنا رب تو میں ایسے ایسے دس لکھتوں کے اجزے کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔

تماشا خامن: ایسی بھری بر سات میں کہاں جاؤں گی۔ جاڑا آنے دو۔ اس وقت کھلے موسم میں دیکھ لیما۔

اصغری: اے بے ادیر کرنا تو اور غصب بے۔ اب جو کام سمجھانے سے نظر گا پھر بڑے جنگلوں سے بھی طنہ ہو گا۔

تماشا خامن: اے بے آپا! گھر چھوڑتے ہوئے تمہارا جی نہیں کڑھتا؟

اصغری: کیوں نہیں کڑھتا؟ کیا میں آدمی نہیں ہوں؟ لیکن یہ تھوڑی دری کا کڑھنا بہتر بے۔ یا عمر بھر کا جا پا؟

تماشا خامن: تم نے اپنی ساس سے بھی اجازت لی؟

اصغری: بھلا دادا جازت دیں گی؟ لیکن ہماری ساس بے چاری سیدھی آدمی ہیں۔ میں سمجھاؤں گی تو یقین بے کہ نہ روکیں گی۔

غرض ایک دن اصغری نے اپنا ارادہ اور اس کی وجہات اپنی ساس سے بیان کیں۔ بات معقول تھی۔ اس میں کون گفتگو کر سکتا تھا۔ اصغری کا جانا تھہر گیا۔ ایک روز جا کر اصغری سب کچا حال اپنی ماں سے بھی کہہ آئی۔ مکتب کے واسطے لڑکیوں کو سمجھا دیا کہ محمود تم سب کو پڑھانے کو بہت ہیں۔ میں صرف دو مہینے کو جاتی ہوں۔ سب لڑکیاں بدستور آیا کریں۔ رخصت ہونے کی تقریب سے پہلے اپنی آپ کے پاس گئی۔ محمد عاقل نے پوچھا ”کیوں بھائی تمیزدار ہو، تم جانتی ہو۔ مکتب کو کیا کر چلیں؟“

اصغری: مکتب اور گھر بار سب آپ کے حوالے کیے جاتی ہوں۔

محمد عاقل: واد! کیا خوب! نہ مجھ کو گھر سے تعلق نہ مکتب سے واسطہ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟

اصغری: تعلق رکشا نہ رکھنا سب آپ کے اختیار میں بے۔

محمد عاقل: تمیزدار ہو، تم کو یہ بات کہنی زیبا نہیں۔ بھلا میرا کیا اختیار بے؟ گھر تمہاری آپا نے چھڑوا�ا۔ ربا مکتب، سو لڑکیوں کا ب۔ لڑکوں کا مکتب ہوتا تو میں خوشی سے سب کو پڑھادیا کرتا۔

اصغری: اب آپا اور آپ دونوں گھر چل کر رہیے۔ اماں جان اکیلی ہیں۔

محمد عاقل: اپنی بہن کو سمجھاؤ۔

اصغری: سمجھانے کی کیا ضرورت بے۔ آپ تو خود جانتی اور تجھستی ہیں۔ یہاں اسکیلے آپ کو بھی تکلیف ہوتی بے۔ نہ بچوں کو کوئی سنبھالنے والا بے نہ گھر کا کوئی دیکھنے والا۔ دکھنکھا آدمی کے ساتھ ہیں۔ بے ضرورت جدار ہنا مناسب نہیں۔ اور پچھلی باتیں گئی گزری ہوئیں۔ آپس کی ناقابلی اور آپس کی رنجش کیسی۔

اکبری جدا گھر کرنے کا مزدہ خوب چکھی چکھی اور بہانہ ڈھونڈتی تھی کہ پھر ساتھ رہنے کو کوئی کہے۔ نورا راضی ہو گئی اور اصغری دونوں کو اپنے ساتھ اولادائی۔ محمد کامل کی ماں کو اصغری کے جانے کا تقاضا تھا۔ اب ان کو بھی تسلی ہو گئی تھی کہ خیر ایک بہو گئی تو دوسرا موجود بے۔ محمود کو البتہ بڑا فکر تھا کہ دیکھئے کیا ہو۔ لیکن اصغری نے ادھر تو محمود کو تسلی کی اور سمجھایا کہ اب وہ باقی نہیں ہیں اپنی آپ کو سمجھادیا کہ محمود وہاب بڑی ہو گئی بے، کوئی خنت سوت اس کو نہ کہئے گا۔ کتاب کے واسطے محمد عاقل سے اتنا کہہ دیا کہ پڑھانا لکھانا وغیرہ سب محمود کو رلیا کریں گی۔ آپ صرف بالائی انتظام کی خبر لے لیا کہیے اور مكتب کی رقم کا حساب کتاب محمود کو لکھادیا کہیے۔

الغرض اصغری رخصت ہوئیں۔ ڈاک پرسوار ہو سیدھی سیالکوٹ پہنچیں۔ یہاں محمود کامل دفتر اصغری کے پہنچنے سے سخت متعجب ہوا اور پوچھا ”خیر یہت بے؟ کہیں اماں سے اڑ کر تو نہیں آئیں؟“

اصغری: توبہ کرو۔ کیا اماں جان میرے برادر کی ہیں کہ میں ان سے لڑنے جاؤں گی؟ اس چار برس میں کبھی تم نے مجھ کو ان سے یا کسی اور سے لڑتے دیکھا؟

یہاں محمد کامل نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے تھے اور بری صحبت میں بتا تھا۔ خوشامدی لوگ جمع تھے اور وہ اس کو اوبنائے ہوئے تھے۔ بازارِ شوت گرم تھا۔ ناق رنگ کا اختر از باقی نہ رہا تھا۔ امیری مٹھاٹھ تھے۔ تخواہ سے چار چند کام معمولی خرق۔ اگر یہی حال چندے اور رہتا تو ضرور جیس صاحب کو بدگمانی پیدا ہوتی اور آخر میں نوکری جاتی رہتی۔ اپنے وقت اصغری پہنچی۔ نورا اس نے ہر طرف سے رخنہ بندیاں کیں اور سمجھایا کہ تم کو خدا نے سورو پے کانو کر کر دیا۔ اس کا یہی شکر یہ بے کہم کو اس پر قناعت نہیں؟ محمد کامل نے کہا ”جو خوشی سے دیتا ہے؟ اس میں کیا قباحت بے؟“ اصغری نے کہا ”سبحان اللہ! اروپیہ بھی ایسی چیز بے کہ کوئی اس کو بے وجہ خوشی سے دیتا ہے؟ ان دونوں لوگ روپے کے اس قدر حاجت مند ہیں کہ عزت تک کی پرواہ نہیں کرتے، مگر وہ پیغمبھر سے نہیں چھوڑتے۔ آدمی اپنے اوپر قیاس کرے کہ ہم کسی کو کیا دیا کرتے ہیں۔ ایک زکوٰۃ کی بھی کچھ اصل بے۔ سینکڑے چیچھے رسول دن چالیسواں حصہ ڈھانی روپے۔ وہی دیتے ہوئے جان ہلتی بے۔ لوگوں کے پاس ایسا کون سا خزانہ تارون بھرا پڑا بے کہ وہ تم کو بے مطلب دے جاتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ کام گزرتا بے نہ دیں گے تو مقدمہ خراب ہو گا، عاجز آ کر قرض دام دے کر، گھروالیوں کے زیور پیچ کر شوت دیتے ہیں۔“

محمد کامل: میں خود نہیں لیتا۔ پھر اس میں کیا ڈربے؟

اصغری: اول تو رشوت چھپ نہیں سکتی۔ عادا و داس کے فرض کیا آدمی پر ظاہرنہ ہوئی، خدا جو پردوں میں دیکھتا ہے، وہ تو جانتا ہے۔ بندوں کا گناہ جمع کرنا اور عاقبت کی جواب دہی سمیٹنا بڑی بے با کی کی بات ہے۔“

غرض تمجھا بجھا کرا صغری نے محمد کامل سے توبہ کرانی۔ چند روز رہ کرا صغری نے پوچھا۔ ”یہ چار آدمی جن کو باہر کھانا جاتا ہے کون لوگ ہیں؟“

محمد کامل: نوکری کے امیدوار ہیں۔ بے چارے غریب اوطن ہیں۔ میں نے کہا، خیر، جب تک تمہاری نوکری لے گئے، تب تک میرے پاس رہو۔

اصغری: پھر اب تک ان کو نوکری نہیں ملی؟

محمد کامل: نوکری تو ملتی ہے لیکن ان کی حیثیت سے کم ہے۔

اصغری: جب ان کی حالت یہ ہے کہ دوسرے کے سر پر پڑے ہوئے روٹیاں کھاتے ہیں تو حیثیت سے کیا بحث باقی رہی۔ تھوڑی بہت جو ملے کر لیں۔

محمد کامل: خدا جانے تم کیا کہتی ہو۔ عزت سے گھٹ کر کیونکر لیں۔

اصغری: کم درجے کی نوکری میں تو بے عزتی ہوتی ہے اور دوسرے کے سر ڈھنگی دینے میں بے عزتی نہیں۔ جب ان لوگوں میں اتنی غیرت نہیں تو اور عادتیں بھی ان میں بری ضرور ہوں گی۔ ان سے کہو کہ یا نوکری کریں یا رخصت ہوں۔

محمد کامل: میری مردوت متفہی نہیں ہوتی کہ جواب دوں۔

اصغری: جب ان میں مردوت نہیں ہے تو تم کو مردوت کا لحاظ کیا ضرور ہے؟ اگر ہم سے بچے تو کہنے میں بہت غریب ہیں۔ ان کا حق مقدم ہے۔ غیروں کو غیروں میں بھی ایسوں کو دینے سے کیا فائدہ؟ اور یہ ضرور نہیں کہ تم تختی سے جواب دو۔ کسی طور پر ان کو سمجھا دو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہی لوگ محمد کامل کے شیطان تھے۔ اصغری نے حکمت عملی سے ان کو ٹالا۔ نوکروں میں جو بد وضع تھے چھانٹ کر زکار لے گئے اور ڈیڑھ ہر سر رہ کر اندر رہا ہر سب نظام درست کر دیا۔

اب میاں مسلم کی شادی ہونے والی تھی۔ اصغری کی طلب میں خط گیا اور تماشا خانم نے بہت اصرار کے ساتھ لکھا۔

از بس کی بہت دن ہو چکے تھے، اصغری نے دبی آنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اپنے دل میں ہو چی کہ محمد کامل کو اکیا جھوڑنا مصلحت نہیں۔ محمد کامل سے کہا کہ مسافرت میں تباہرہ نامنا سب نہیں کوئی رشتہ دار ساتھ رہنا ضرور ہے۔ سو میرے نزدیک تم اپنے

خالہ زاد بھائی صاحب کو بیا او۔ وہ تمہارے ساتھ پچھری کام بھی کر سکیں گے اور شاید کہیں ان کو نوکری بھی لگ جائے۔ امیر نیگم کو خط لکھا گیا اور اصغریٰ کے رہنے میں صاحب پہنچ گیا۔

یہ لڑکا پر لے درجے کا نیک بخت تھا۔ اسم بامسٹنی اور محمد کامل سے عمر میں بڑا۔ اب اصغریٰ کو اٹھینا انہوں تو سیالکوٹ سے رخصت ہوا۔ اسی میں مولیٰ محمد فاضل کے پاس ایک ہفتہ مقیم رہی۔

اصغری کی صلاح سے مولوی محمد ناضل نے

پیشہ لی اور بڑے بیٹے محمد عاقل کو اپنی جگہ رکھا دیا

مولوی محمد ناضل کی تبر سائٹھ بر س کے قریب تھی۔ محترمی کی نوکری میں مختت تھی بہت۔ روز باناغہ سب حاکموں کی پکھری میں رئیس کے مقدمات کی خبر لینا اور صبح و شام علماء میں جانا۔ بے چارے مولوی صاحب رات کو تو بہت تحکم جاتے تھے۔ اصغری نے کہا ”ابا جان، اب آپ کی تمراس مشقت کے تامل نہیں۔ منا سب بے کہ آپ گھر بیٹھنے کا فکر کیجئے۔“ آیک کتاب میں، میں نے پڑھا بے کہ انسان عمر کے تین حصے کرے۔ پہلا حصہ بچپن کا، دوسرا حصہ دنیا کے کاموں کے بندوبست کا، تیسرا آرام اور یادِ الہی کا۔ بس اب آپ گھر چل کر آرام سے بیٹھئے۔“

مولوی صاحب: اول تو رئیس نہیں چھوڑتا، دوسراے آخر میں میری جگہ کوئی کام کرنے والا بھی چاہیے۔

اصغری: رئیس سے جب آپ اپنی شعفی کاغذ رکھنے گا تو گمان غالب بے کہ مان جائے اور کام کرنے کو بھائی جان کیا کم ہیں؟

مولوی صاحب: وہ پکھری دربار کا دستور قاعدہ کیا جائیں۔

اصغری: چند روز ان کو بیا کر ساتھ رکھیے۔ دیکھنے بھالنے سے سب معلوم ہو جائے گا۔ وہ تو مولوی آدمی ہیں۔ ہندو لوگ تو اوٹ پلانگ فارسی کی دوچار کتابیں پڑھ کر پکھری کی نوکری کرنے لگتے ہیں۔

مولوی صاحب کو اصغری کی بات پسند آئی۔ اصغری نے تو دبلي پچھی اور مولوی صاحب نے محمد عاقل کو بیا بھیجا۔ چند روز عاقل نے باپ کا سب کام اٹھایا اور رئیس کو اپنی خدمت سے بہت خوش کیا۔ تب مولوی صاحب نے کہا اب یہ لڑکا آپ کی خدمت میں حاضر بے مجھ کو آزاد فرمائیے۔

رسم	است	کہ	ماکان	تخریب
آزاد	کنند	بندہ	بے	پیر

رئیس صاحب کا دل بڑا نہیں تھا۔ بیس روپے تا حیات مولوی صاحب کی پیشہ کر دی۔ مولوی صاحب کی جگہ محمد عاقل کو پوری تختواہ پر رکھ لیا۔

محمودہ کی ملنگی

اصغری دبلي آئی تو اس نے محمودہ کا فنگر کیا۔ حسن آراج بھر سے نیکے آئی تھی اور ان ہی دنوں جمال آراج بھی سرال سے چھوٹی بہن سے ملنے کے لیے آ پہنچی۔ حکیم جی کا تو تمام گھر اصغری کا مرید تھا۔ دنوں بہنیں اصغری کے آنے کی خبر سن کر دوڑی ہوئی آئیں۔ ہر طرح کی باتیں رہیں۔ جمال آرانے کبہ ”استانی جی“ کیسا بھی تم میں پڑا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ بھلا حسن آرت تو تمہاری شاگرد ہیں، لیکن میں شاگروں میں سے بھی زیادہ ہوں۔ میرا جزا ہوا گھر تم نے ہی بسوایا۔“ اصغری: میں کس لائق ہوں۔

جمال آرا: واد استانی جی! میں تو جیتے جی تمہارا سلوک نہیں بھاوں گی۔ اور کیا کروں، تم ہم لوگوں کی خدمت کسی طرح قبول نہیں کرتیں۔ نہیں تو اپنی کھال کی جوتیاں تم کو بنوادیتی، تب بھی تمہارا حق ادا نہ ہوتا۔

اصغری: اول تو کچھ خدمت مجھ سے بن نہیں پڑی اور باقتفنا نے سرداری کوئی کام آپ کو پسند ہوا تو یگم صاحب، آپ کو خدا نے سب تابل بنایا ہے۔ ہم غریبوں کا خوش کر دینا کیا بڑی بات ہے۔

حسن آرا: اے بے! استانی جی، تم اپنے منہ سے کیسی بات کہتی ہو؟

اصغری: سنو، بو حسن آرا۔ استانی گیری اور شاگردی تو اب باقی نہیں۔ وہ مکتب تک تھی۔ اب اللہ رکھے رکھے تم بیا ہی گئیں۔ ادھر تم پورتوں کی امیر اور امیروں کی سرستانت۔ ادھر یہ سردار اور سرداروں کی بیٹی بہو۔ اب اس شہر میں تم سے بڑھ کر تو دوسرا امیر نہیں۔ تم تک پہنچ کر جو آدمی محروم رب تو اس کی قسمت کا صورت۔

حسن آرا: اچھی استانی جی کیا بات ہے؟

اصغری: بو اپرا مشکل کام بے۔ تم وعدہ کرو کہ مجھ کو تا امید نہ کرو گی تو کہوں۔

حسن آرا اور جمال آرانے جاتا کہ کسی نوکری چاکری کے واسطے کہیں گی۔ دنوں نے کبہ ”استانی جی“ خدا کی قسم تمہارے واسطے ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔ اوہم کو تو بڑی تمنا بے کر تم ہم سے کوئی فرمائش کرو۔“

اصغری: وہ کام میرے نزد یک تو برابر لیکن آپ دنوں صاحب دل سے آمادہ ہوں تو کچھ حقیقت نہیں۔

دونوں بہنوں نے کبہ ”استانی جی“ خدا جانتا ہے، ہمارے کرنے کا کام ہو تو ہم کو دریغ نہیں۔“

جب خوب پکا کر ایسا تو اصغری نے کبہ ”میری آزو بے کہ محمودہ کو اپنی فرزندہ میں قبول کرو۔“

یہ سن کر دونوں بہنوں نے سکوت کیا۔ پھر اوہر اور کی باتیں ہونے لگیں۔ جب دونوں اٹھنے کو ہوئیں تو اصغری نے ایک باتھ سے تو حسن آرا کا دوپٹہ پکڑا اور دوسرا سے باتھ سے جمال آرا کا اور کہا ”میں حق اب لڑ جگڑ کرلوں گی اور جب تک میرا سوال پورا نہ ہو گا، خدا کی قسم جانے نہ دوں گی۔“

حسن آرا: استانی جی، بھلا اس میں ہمارا کیا اختیار ہے۔ ابھی تو ارجمند خان لڑکا بے۔ دوسرا سے ایسی باتوں میں ماں باپ کے ہوتے ہوئوں کی کون سنتا ہے۔

اصغری: بڑی اور بیاہی ہوئی بھینیں بھی ماں باپ کے برادر ہوتی ہیں۔ اور رشتہ ناتے بغیر سب کی صلاح کے نہیں ہوا کرتے۔ ایسا ممکن نہیں کہ تم سے مشورہ نہ ہو۔

حسن آرا: ابھی ہمارے یہاں تو کچھ تذکرہ کہیں کا نہیں ہے۔

اصغری: تم کو معلوم ہو گا۔ علوی خاں کے یہاں رقعہ گیا تھا۔ واپس آیا۔

جمال آرا: استانی جی، تم نے سائبے تو گیا ہو گا۔ مگر ہم سے اس معاملے میں اس وقت تک کچھ بات چیت نہیں ہوتی۔ علوی خاں میں کیا برائی تھی۔ خدا جانے رقعہ پھر واپس کیوں لیا ہو گا۔ اتنی بات میں بات اور ہونے لگی۔

اصغری: صاحبو، میرا مطلب رہا جاتا ہے۔ یاں تاں کا جواب مجھ کو دیجئے۔

جمال آرا: استانی جی، بھلا ہم کیوں کرہائی بھر سکتے ہیں؟

اصغری: دولت، سیرت، صورت تین چیزیں ہوتی ہیں۔ دولت تو ہم غربیوں کے پاس ہام کو نہیں۔ رہی سیرت بوا حسن آرا تم محمودہ سے بخوبی و اتفاق ہو۔ دوسرس تumber اس کا ساتھ رہا۔ تجھ کہنا شرم، لکھا ادب، تاءعدہ، نیک بخشی، ہر کام کا سلیقہ اور ہر طرح کا بہتر، لکھنا پڑھنا، سینا، پرونا، پکانا، یہ سب باتیں محمودہ میں ہیں یا نہیں؟ کچھ اس پر موقوف نہیں کہ محمودہ میری نندیا میری شاگرد ہے۔ نہیں۔ وہ اڑکی کچھ خدا نے ہمہ صفت موصوف بیدا کی ہے۔ کیوں بوا حسن آرا، میں کچھ بڑھ چڑھ کر کہتی ہوں تو تم بولو۔

حسن آرا: استانی جی، بھلا چاند پر کوئی خاک ڈال سکتا ہے۔ محمودہ بیگم ماشا، اللہ بڑے گھروں میں اپنا انی نہیں رکھتی۔ بھلا کوئی محمودہ بیگم کا پاسنگ تو ہو۔

اصغری: اور صورت اسونا ک، کان، آنکھو جیسے آدمی ہوتے ہیں، محمودہ میں بھی ہیں۔ وہ بھی آدمی کا پچھہ ہے۔ جوان ہونے پر کچھ اس سے زیاد صورت نکل آئے گی۔

جمال آرا: اے استانی جی، محمودہ بیگم کو آدمی کا بچہ کہتی ہو۔ خدا کی قسم حور کا بچہ۔ بڑے گھروں میں اوپھی دکان پھیکا کپوان،

ہم نے تو کوئی صورت دار نہ دیکھا۔ ہم ہی دو ہنپیں موجود ہیں خدا کی قسم بعض اونٹیاں ہم سے اچھی ہیں۔ اور محمود تو چندے آفتاب اور چندے ماہ تاب۔ اس صورت کے آدمی کہاں نظر آتے ہیں۔

صغریٰ: پھر بوسائے غربتی کے اور ہم میں کیا برائی ہے؟ اگرچہ جھوٹا منہ بڑی بات بے لیکن غالی خان مر جوم کو دو چار پیشیں نہیں گزریں۔ آخر ہم بھی ان کے نام لیوا ہیں۔

دونوں ہنپیں نے کہا ”استانی جی، تم ہماری سرتان ہو اور ہم اور تم کیا دو دو ہیں۔ ایک ذات ایک خون۔“

صغریٰ: پھر کیا تامل ہے؟ میری درخواست قبول فرمائیے۔

حسن آرا: اچھا استانی جی، آج ہم اس بات کا مدد کو رامان سے کریں گے۔

صغریٰ: مدد کرنے میں بھی کر سکتی ہوں۔ بلکہ دل سے اس کی مدد کرو۔ اور اب یہ بات چھڑی بنت تو ایسا ہو کہ پوری ہو جائے۔

دونوں ہنپیں نے وعدہ کیا کہ استانی جی، جیسا آپ کا ارادہ ہے، انشاء اللہ ویسا ہی ہو گا۔ غرض کہ اس وقت دونوں ہنپیں رخصت ہو گئیں۔ اگلے دن اصغریٰ خود سلطانہ نیگم سے ملنے گئی۔ دوسرو پہ کا بہت عمدہ شانی رو مال جو سیا لکوٹ سے لائی تھی، سلطانہ نیگم کو نذر رکیا۔ سلطانہ نیگم نے کہا ”استانی جی، تم تو ہم کو بہت شرمند کرتی ہو۔ ہم کو تمہاری خدمت کرنی چاہیے نہ کہ اللاتم سے لیں۔“

صغریٰ: یہ رو مال میں نے صرف آپ کے لیے فرمائش کر کے بنا یا تھا اور یہ تو آپ کو قبول کرنا ہی ہو گا۔ ڈیڑھ برس سے اسی امید میں میری گھنٹہزی میں بندھا تھا کہ دبلي چال کر خود پیش کروں گی۔

سلطانہ نیگم: میں اس کو بطور تبرک لے لیتی ہوں۔ لیکن مجھ کو خدا کی قسم شرم آتی ہے۔ کبھی آپ نے بھی تو کچھ فرمائش کی ہوتی کہ میرا دل خوش ہوتا۔

انتسابارا پا کر اصغریٰ دست بستہ گھنٹہزی ہو گئی اور اپنا مطلب بیان کیا۔

سلطانہ: اچھا استانی جی، آپ بیٹھئے تو۔

صغریٰ: اب میں اپنی مراد لے کر ہی چھپوں گا۔

سلطانہ نیگم نے ہاتھ پکڑ کر محالیا اور کہا کہ بیٹا ہنپیں کے کام مشکل کام ہیں۔ کمبار کے ہاتھ سے دمڑی کا پیالہ لیتے ہیں تو اچھی طرح ٹھوک بجا کر لیتے ہیں اور یہ تو عمر بھر کی کمائیوں کے بیو پار ہیں۔ بڑے سوچ بچار اور صلاح مشورے سے ہونے کے ہیں۔ آپ نے ذکر کیا، اب میں ان کے باپ سے اور اپنی بڑی بہن سے، کنبے کے اور دو چار آدمیوں سے

پچھوں گھوں۔ پھر جیسا ہو گا دیکھا جائے گا۔ اور ابھی تو ارجمند خان لڑکا ہے۔ اس کے بیاد کی کیا جلدی ہے۔

اصغری: حوصلے سے بڑھ کر میں نے سوال کیا ہے۔ جس طرح مصر میں کوئی بڑھیا عورت سوت کی اٹھی لے جا کر حضرت یوسف علیہ السلام کی خریدار بنی تھی۔ اتنی طرح میرے پاس غربتی اور عاجزی کے سوا کچھ دینے کو نہیں۔ صرف آپ کی مہربانی درکار ہے۔

ہر چند سلطانہ بیگم نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن انداز سے معلوم ہوا کہ بات ہاگوارنہ ہوئی۔ چلتے ہوئے اصغری جمال آرا اور حسن آ راستے کہتی آئی کہ اب اس کا بنا دا آپ اگوں کے اختیار میں ہے۔ اصغری کے جانے کے بعد دونوں بہنوں نے محمودہ کی حد سے زیادہ تعریف کی۔ سلطانہ تو نیم راضی ہو گئی، لیکن شاذ مانی بیگم کی بھی ایک بیٹھی دلدار جہاں اور مدت سے شاذ مانی بیگم اپنی بیٹھی کے لیے ارجمند کو تکئے نیٹھی تھی۔ ابھی تک اپنی بہن سے کچھ اس کا تذکرہ نہیں کرنے پائی تھی۔ جب اصغری نے محمودہ کی نسبت گفتگو کی تو سلطانہ بیگم نے شاذ مانی بیگم سے پچھوا بھیجا کہ آپ کے نزد یہ کیا بات کیسی نہ۔ شاذ مانی بیگم یہ حال سن کر بہت سست پائی اور اس فکر میں ہوئی کہ کسی طرح محمودہ کی بات دب جائے تو دلدار جہاں کی پس جمادوں اس وقت تو اتنا ہی کہا۔ بھیجا کر میں سوچ کر جواب دوں گی۔ اگلے دن خود بدولت آموجو ہوئیں۔ اور جب ذکر چاہ تو سلطانہ سے کہا کہ کہا تم اور کہا ملاؤ صاحب! از میں آسان کا جوڑ۔ یہ بات یہاں لایا تو کون لایا؟ سلطانہ نے کہا ”استانی جی!“

شاذ مانی: دیکھو! میں خود استانی جی کے پاس جاتی ہوں۔

حسن آ را کو ساتھ لے کر جبٹ سے اصغری کے پاس جا دیکھیں اور کہنے لگیں کہ استانی جی، تم تو ایسی عظیم ہو اور تم نے اتنا نہ سمجھا کہ ایسے رشتے برادر کی ملکہ کیے کیے جاتے ہیں؟ علوی خاں کے گھر سے صرف اتنی بات پر رتعہ پھرا کر انہوں نے سونے کا چیپر کھٹکھٹ نہیں مانا۔ بھا تم محمودہ کو کیا دو گی؟

اصغری: بیگم صاحب، میں نے لڑکی کے بیاد کا ذکر چھیڑا تھا، کچھ لڑکی کے مول تول کا پیغام نہیں دیا۔ شہر میں اگر چاہ کل رسمیں بگڑ گئی ہیں لیکن وضع دار لوگوں میں لینے دینے کا چکوتا کہیں نہیں سننا۔ جو بیٹھی دے گا، وہ کیا اٹھا رکھے گا؟ باقی رہی برا بری، سو ظاہر بے کر دولت کے اعتبار سے ہم کو کچھ نسبت نہیں۔ یہاں تو علوی خاں کا چوتھائی بھی نہیں۔ لیکن آپ تو لڑکا بیا ہتی ہیں۔ آپ امیری غربتی سے کیا بجھت؟ لڑکی دینی ہو تو انسان یہ بھی سوچ کر کہ بھائی لڑکی کا گزر دیکھ لو یا کوئی غریب ہو اور ہیو کے جیزیر پر ادھار کھائے بیٹھا ہو، وہ امیر گھر ڈھونڈتے تو جائے سرتب۔ آپ تو بیٹھی یقین ہیں اور سب کچھ خدا کا دیا ہو آپ کے ہاں موجود ہے۔ آپ کو صرف لڑکی دیکھنا بے سو محمودہ کا کوئی حال آپ سے مختین نہیں۔ صورت، شکل، ذات جو

کچھ بری بھان بنے، وہ آپ کو معلوم ہے۔

شاوز مانی: کیا ہوا۔ پھر بھی جوڑ دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔

صغری: نیگم صاحب، خطا معاف۔ اب جوڑ کہاں ہے۔ جوڑ تو ان دونوں کا تھا جب علی نقی خاں نے اس گھر میں بہن کو بیاہ دیا تھا یا یہ وہی گھر بے کہ بیٹی لینے کے واسطے بھی جوڑ نہیں۔ اب کیا اس گھر میں کیڑے پڑ گئے ہیں؟ دولت نہیں سو یہ بڑا بول خدا کو نہیں بھاتا۔

صغری نے شاد زمانی کو ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ بات نہ بن پڑی اور شاد زمانی نے کہا "استانی جی، تم تو خفا ہوتی ہو۔"

صغری: نیگم صاحب، میری کیا حوالہ ہے۔ مجھ کو امید تھی کہ آپ میری مد دیجئے گانہ کے خود آپ ہی کو گوار بے۔

شاوز مانی: استانی جی، برآ نویا بھا، جوڑ نہیں۔

صغری: دولت میں بے شک جوڑ نہیں ہے۔ ذات میں برابری کا دعویٰ ہے۔ بنر میں انشاء اللہ وہ ہماری جوڑ نہ تھیں گی۔

کیا مفہاً تقاً ایک بات میں وہ کم، ایک بات میں ہم کم۔ جیسی بہو دنیا میں چنان لے کر ڈھونڈتی پھریں گی تو نہیں پائیں گی۔

شاد زمانی: استانی جی، اقبال مند خاں کے لڑکے کا رقصہ کیوں نہیں ملنگا تھیں؟

صغری: کچھ خدا نخواستہ لڑکی ہم کو دو بھرنہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا بہ آپ کی دلدار جہاں نیگم سے تو میں جانتی ہوں دو

ڈھانی پرس چھوٹی ہو گی۔ جب آدمی ڈھونڈنے پر آتا تب تو راتوں کی کیا کی ہے۔ لڑکیوں کو لڑکے بہت اور لڑکوں کو لڑکیاں بہت۔

میں نے سوچا تھا کہ بنر اور دولت ساتھ ہے۔ یہ چیز امیر دوں کے لائق ہے اور امیر اس کو زیبا ہیں۔ بات تھیں جائے تو

دونوں کے لیے اچھا بے لیکن اگر منظور نہیں بنے تو آپ دلدار جہاں سے نسبت کر دیجئے۔

شاوز مانی نیگم: میرا را دو بے کہ دلدار کو غیر جگد دوں۔ رشتے میں رشتہ بے لطفی سے خالی نہیں ہوتا۔ شاد زمانی نیگم تو یہ کہہ کر

رخصت ہوئیں، حسن آرائی ہمیں رو گئی۔ خالہ نے کہا بھی کہ بیٹا چلو۔ حسن آرabolی "آپ چلتے" میں استانی جی سے کئی پرس

میں مل ہوں۔ باتیں کروں گی۔" جب شاد زمانی چل گئی تو حسن آرائے کہا۔ "استانی جی، اماں راضی ہیں۔ یہی حضرت

بات کو بگاڑ رہی ہیں۔ منہ سے انکار کرنے ہیں تو کرنے دو۔ ان کا اصل مطلب یہی ہے کہ دلدار کی بات تھیں جائے۔"

صغری: اب تقدیر کی بات ہے۔ بھلا ان کے ہوتے ہماری کیا اصل ہے؟ لیکن یواحسن آرا، میں نے کچھ بے جا بات نہیں

سوچی تھی۔ پیوند میں پیوند ماتا دیکھ لیا تھا۔ تمہارا اتنا بڑا گھر اور اللہ آمین کا ایک لڑکا۔ جو کچھ مال و متاع ہے سب اسی کا ہے۔

پس اتنے بڑے کارخانے کے سنبھالنے کو بھی بڑی عقل اور بڑا سایقہ چاہئے۔ محمود غریب گھر کی بے تو کیا، اللہ رکھے حوصلہ

اور سایقہ امیر دوں جیسا بے۔ تمہارے گھر میں اگر کوئی بے سایقہ آئی اور جیزیر کے چکڑے لے جائے تو کس کام کی؟ اس کو اپنے جیزیر کا

رکھنا اٹھانا مشکل پڑ جائے گا۔ تمہارے گھر کا انتظام کیا کر سکے گی؟ محمود تو ماشاء اللہ ملک کا انتظام کرنے والی بے۔ پھر بوا حسن آرایہ بات بھی سوچنی چاہیے کہ رشتہ ناتا کس غرض سے ہوتا ہے۔ دنیا سے جہاں تک ہو سکے میں ملاپ کو بڑھانا چاہیے۔ گھر کے گھر میں نسبت ناتا کر لیا تو کیا؟ شادی بیاہ جب کرے، غیر جگہ۔ اور اپنی بات تمہارے روپر و تمہاری خالہ نے بھی کہی اور یہ رائے ان کی بہت درست ہے۔

حسن آرا: استانی جی، میں اور آپا نے خوب خوب طرح پر اماں سے کہا بے اور اب یہ سب باتیں میں اماں سے آبھوں گی۔
امید تو بے کے یہیں بات درست۔

غرض اصغری نے یہ سب پڑھا کر حسن آرا کو رخصت کیا۔ وہاں شادِ زمانی نے سلطانہ سے جا کر کہا ”بوا“ میں نے تو استانی جی کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا کہ تمہارا ان کا جو زندگیں۔ آدمی کو سمجھ کر بات منہ سے نکانی چاہیے۔“ لیکن یہ آپڑا تھا کہ شادِ زمانی اپنے منہ سے اپنی لڑکی کے واسطے کہہ نہیں سکتی تھی۔ یہ بات مدتؤں سے شادِ زمانی کے دل کو گئی ہوئی تھی لیکن قرابتِ مندی کے گھمنڈ پر اس نے تیگ و دونہ کی۔ وہ سمجھی کہ جلدی کیا بے۔ لڑکا گھر میں بے۔ جب موئی ہو گا، مردوں میں بات ہو جائے گی۔ اب محمود کی بات میں غریبیں بڑا اعتراض تھا۔ آخر شادِ زمانی سے الگ ہو کر سلطانہ بیگم نے اپنی دونوں بیٹیوں سے جو صلاح کی تو حسن آرا نے کہا ”اماں، بات صاف تو یہ بے کہ خالہ اماں ولدار کے واسطے تجویز کرتی ہیں۔“

سلطانہ نے کہا ”بھلا ارجمند سے بھی تو ہنسی ہنسی میں پوچھو۔“

جمال آرا نے بھائی کو بایا اور کہا ”کیوں بھائی، تمہاری شادی بیاہ کی تجویز ہو رہی ہے۔ تم بھی تو کچھ باؤ۔ ولدار جہاں سے راضی ہو؟“

اماں کے منہ پر لحاظ کے سبب ارجمند کچھ نہ بوا، لیکن اشارے سے اپنی بہنوں سے انکار کیا۔ اس کا انکار جمال آرا اور حسن آرا کے لیے جبت ہو گیا۔ حسن آرا نے کہا ”صورتِ ٹھیک، سلیمانیہ باتیں تو محمود کے پاس گئی کسی لڑکی میں نہ ملیں گی۔ اس کا ذمہ تو میں کرتی ہوں۔ باں، کچھ چاہو کہ سونے کا چیپر کھٹ ملے، سو یہ ان بے چارے غریبوں کے پاس کہاں؟“

سلطانہ: بوا، اصل تو لڑکی دیکھنا بے۔ اللہ کے فضل سے ہمارے گھر میں خود کسی چیز کی کفی نہیں۔ ہم کو بھاری جنیز لے کر کیا کرتا ہے؟

جمال آرا: پھر کیا تامل بے؟ بسم اللہ کیجئے۔

حسن آرا: گو غریبی بے لیکن استانی جی بڑی تدبیر کی آدمی ہیں۔ منہ سے نہیں کہیں تو کیا بے وقت پر حیثیت سے بڑھ کر کریں گی۔

سلطانہ: اچھا تمہارے بابا لیں تو ان سے بھی صلاح پوچھی جائے۔

چھوٹے حکیم صاحب آئے تو جمال آ را اور حسن آ را نے بھی محمودہ کے مقدمے کو اس طرح پیش کیا جیسے کچھری میں وکیل اپنے موکل کے مقدمے کو پیش کرتے ہیں۔ غرض چھوٹے حکیم صاحب نے بھی محمودہ کی بات کو پسند کیا۔ اب تو دونوں بھینیں بے تحاشا اصغری کے پاس دوڑی گئیں۔ محمد کامل کی ماں کو اصلاح ان باتوں کی خبر نہ تھی۔ انہوں نے پوچھا بھی کہ کیا بنگم صاحب اس طرح کیوں دوڑتی ہو؟ پانچ تو اٹھا کر چلو۔

حسن آرا: کچھ نہیں۔ استانی جی کے پاس جاتے ہیں۔

اصغری کے پاس جاتے ہی حسن آ را نے کہا ”ستجے استانی جی، مبارک! ہمارا انعام دوا یے۔“

اصغری نے کہا ”خدایتم سب صاحبوں کو بھی مبارک کرے۔ اور انعام دینے کا ہمارا کیا منہ بے۔ میرا انعام بے دعا۔ سو شبانہ روز میں تمہاری دعا گو ہوں اور جب تک جیوں گی دعا گو رہوں گی۔“ اور آب دیدہ ہو کر یہ بھی کہا ”اللہی! انعام بخیر! الہی سازگاری! اللہی! مجھنا چیز کی سرخراوی! اللہی! محمودہ کو دنیا اور دین کی برکت! اللہی! محمودہ دو دھوں نہائے اور پتوں پھٹے! اللہی! محمودہ بوڑھہ بھاگن ہو!“

حسن آرا: نہیں استانی جی، ہم تو آنے اپنا منہ ضرور یٹھا کرائیں گے۔

اصغری: بیٹھئے بیٹھئے۔ مٹھائی کھائیے۔

دیانت کو بائا پانچ روپے نکال اس کے باتحہ دیئے اور کہا گئئے والے کی دکان پر سے بہت عمدہ قلاقلہ اور دربیے کے مکڑ سے بیٹھی کی مٹھائی اور شادتا را کی گلی سے موتی پاک اور چاندنی چوک سے اوزات اور نیل کے کٹھے سے گلی کی تلی دال اور خانم کے بازار سے نمش ابھی جا کر لاؤ۔ اتنے میں دونوں کو دو گلوریاں بنائیں اور مٹھائی کی ٹوکری آ موجود ہوئی۔ اصغری، اکبری، حسن آرا، جمال آ را، سب نے مل کر خوب کھائی اور جو بچی مکتب میں بھیج دیں۔ اب چلتے ہوئے اصغری نے کہا ”اس وقت تک میں نے اماں جان کو خبر نہیں تھی، اب ان سے تذکرہ کر کے انشاء اللہ پر سوں اچھی تاریخ اور اچھاداں بے،“ معمولی رسم ادا ہو جائے۔“ یہ دونوں رخصت ہوئیں تو اصغری نے ساس سے کہا ”اماں جان، کچھ محمودہ کا بھی فکر ب؟“ ساس: کیا فکر کروں؟ کہیں سے بات بھی آئے۔ میں ایک جگہ سوچے بیٹھی ہوں محمد صالح کے ساتھ محمودہ کا بیاہ کروں گی۔ اصغری: کجا محمد صالح اور کجا محمودہ۔ بھائی محمد صالح کی عمر بھائی جان سے کچھ کم نہ ہوگی۔

محمد کامل کی ماں: باں، عاقل سے چھومنیے محمد صاحب بڑا بے۔ دونوں ایک ہی رس پیدا ہوئے تھے۔

اصغری: بھلا پھر تھوڑا فرق بے؟

محمد کامل کی ماں: اور تو کہیں سے سلام پیام نہیں۔

اصغری: میں نے ایک بات سوچی بے۔ اگر آپ کو پسند ہو تو ذکر چاہوں؟

محمد کامل کی ماں: وہ کیا بے؟

اصغری: حکیم فتح اللہ کے لڑکے سے۔

محمد کامل کی ماں: بھلا بیٹی، جھونپڑے کارہنا اور محلوں کے خواب دیکھنا۔ کجا حکیم کا گھر۔ آن ان کے یہاں ماشاء اللہ وہ دولت بے کہ شہر میں ان کا ثانی نہیں۔ اور کجا ہم غریب کر رہے تک کا جھونپڑا بھی درست نہیں۔ یہاں کی بات کیا ان کی خاطر تلے آئے گی۔ حق کہہ کر بھی پشیمان ہوتا ہے۔

اصغری: وہ دولت مند ہیں تو اپنے داسٹے ہیں۔ ہم کیا خدا نہ کرے کچھ ان کے دست نہ ہیں؟ وہ اپنے پاؤ زردے میں مست ہیں تو ہم اپنے دلیے میں گن ہیں۔ ذات میں ہم ان سے ہیئے نہیں۔ ہنر جو ماشاء اللہ ہماری محمودہ میں بے ودان کے بڑوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔

محمد کامل کی ماں: بو، دولت کے آگے ہنر ہاتھ باندھ کھڑا رہتا ہے۔ سونے کا چیپر کھٹ پہلے بنوالوں تب ان سے بات کرنے جاؤں۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ تم اس کا خیال مت کرو۔ اے علوی خاں میں کیا برائی تھی؟ رقم بحیج کرانہوں نے الٹا مانگوا لیا۔ بو، غریبوں کی کھپت غریبوں ہی میں ہو سکتی ہے۔

اصغری: ہزار دولت کی ایک دولت تو خوبصورتی بے۔ چشم بد دور ہماری محمودہ سے بہتر کرنے میں تو ڈھونڈ لیں۔

محمد کامل کی ماں: بو، تم کیسی لڑکیوں کی تی باتیں کرتی ہو۔ حسن بھی ہمسری کی حالت میں پوچھا جاتا ہے۔ اور پھر یہ بات منہ سے کہنے کی بے کہ ہماری لڑکی خوبصورت بے؟ اور میں تو نہیں تھھتی کہ خوبصورتی کیا بابے۔ بڑی بڑی خوبصورتوں کو دیکھا جو یوں کے برادر قدر نہیں اور بد شکلیں ہیں کہاں کی الال بنی بنیشی ہیں۔

اصغری: خوبصورتی بھی ایسی چیز بے کہ آدمی پر فریفت نہ ہو؟ مگر اکثر آدمی جن کی صورت اچھی ہوتی ہے، سیرت کے خراب اور مزان کے گندے ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی صورت پر ماز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی وال کہیں نہیں گلنے پاتی اور ان کا مزان ان کے حسن کی قیمت گھٹادیتا ہے۔ لیکن اگر صورت کے ساتھ خدا سیرت بھی اچھی دے تو سبحان اللہ! انور علی نور۔

جیسی ہماری محمودہ کی صورت، ویسی سیرت۔ دونوں ماشاء اللہ ایک کا جواب ایک۔

محمد کامل کی ماں: آخر کچھ دینے کو بھی چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی تمہارے مکتب کی کوئی لڑکی خدا جانے کیا پڑھ رہی تھی اور محمودہ اس کو معنی سمجھا رہی تھی کہ یا تو فیل باتوں سے میل جول مت کرو اور کرنا بے تو ہاتھی کی آمد و رفت کے لائق گھر کا دروازہ بھی اوپر نہیں گا۔ ہم غریبوں کے پاس ان کی شان کے لائق دینے کو کہاں؟ حق بیٹھے بھائے اپنی بُنی کرانی کیا ضرورت؟ اور فرض کیا بات ہو بھی گئی اور لڑکی بے نظر وہ میں تھیرہ ہی تو نقصان مایہ اور شامت نہ سایہ۔

صغری: عزت اور ذلت کچھ جیزیر پر مختصر نہیں۔ رہی میاں بی بی کی موافقت تو یہ اور ہی چیز ہے۔ جمال آرا کیا کم جیزیر لے گئی تھیں؟ لیکن ایک دن بھی سرال میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ دور کیوں جاؤ۔ ہماری آپا کو بھی ہمارے ہی برادر ملا تھا۔ پھر کیوں روزانہ لڑکی رہتی ہے؟ یہ تو اپنا اپنا مزان اور اپنا اپنا سلیقہ ہے۔

محمد کامل کی ماں: یہ تو میں نے ماں کہ میاں بی بی کا پیارا خلاص جیزیر پر موقوف نہیں۔ لیکن کنبے کے اوگ بے کہے کب باز آتے ہیں اور لڑکے نے خیال نہ کیا تو کیا بے۔ ماس نندیں ہی موت پا کر کبھی بات میں بات کہہ گزریں۔ آخر دل کو بر الگتا ہی ہے۔ ایک تو بیٹی والے کا یوں ہی سرنیچا بے، اس پر دان جیزیر واجب اور غصب ہے۔ نہ بوائیہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔

صغری: کنبے والوں سے کیا مطلب؟ کنبے والے ہر روز تھوڑے ہی پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ ہاں، ماس نندوں کے رات دن کے طعنے بے شک غصب کا سامنا ہے۔ سو حسن آرا اور جمال آرا طعن و تشنج کا تو کیا ذکر محمودہ کے پاؤں دھنودھو کر پیا کریں گی۔ ایسا بھی کیا اندھیر ہے۔ کیا بیاد ہوتے کے ساتھ آنکھوں پر محکم کریاں رکھ لیں گی؟ حسن آرا کو جیسی محبت محمودہ کے ساتھ ہے، آپ تو دیکھتی ہیں۔ رہیں جمال آرا سو دل کی خدا جانے ظاہر میں تو جب بلتی ہیں، بچھی جاتی ہیں۔ میں بھی تو آخر جیتی بیٹھی ہوں محمودہ کو بری طرح رکھیں گی تو مجھ کو کیا مند کھانیں گی۔ اور سو بات کی ایک بات تو یہ کہ ماس نندیں بھی ہوادیکھا کرتی ہیں۔ لڑکے کو تجھما ہوادیکھیں گی تو کسی کی مجال نہیں کہ محمودہ کو آنکھ بھر کر دیکھ لے۔

محمد کامل کی ماں: آخر تماری مرضی کیا بے؟ شربت کے پیالے پر نکاح پڑھادوں؟

صغری: یہ تو میرا مطلب نہیں۔ اور نبوت میں شربت بھی نہیں جزتا تو کیا بیٹا بیٹی کے کام کا نہیں کرتے۔ دینا دلانا بھی دنیا کی رسم ہے۔ مگر جتنی چادر دیکھیے اتنے پاؤں پھیلائیے۔ مقدور کے موافق جو بن پڑا دیا، نہ بن پڑا نہ دیا۔ نام نہود کے پیچھے گھر کا دیوالیہ نکال بیٹھنا بھی عقل مندی کی بات نہیں۔ میرے مکتب میں سلمی لڑکی پڑھتی ہے۔ اس کے ابا کو غدر کے پیچھے سر کار سے دس ہزار روپے انعام ملا تھا۔ کسی میم کی جان بچائی تھی۔ دس ہزار روپے ان کو اتنا تھا کہ عمر بھر آبرو سے رہتے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی بیانے اٹھے۔ شنی میں آ کر دس ہزار سر کار کا دیا ہوا اٹھا بیٹھے اور ہزار پان سو اور پرست قرض لے

کر لگا دیا۔ اس وقت تو خوب ہر طرف واوا دھوئی، اب گھر میں اس قدر تیک بے کہ کھانے تک کو جیران ہیں۔ بیاہ میں مجھ کو بھی باوا آیا تھا۔ سامان دیکھ کر میں تو دنگ ہو گئی۔ بلکہ سلمی کی اماں نے بر ابھی مانا ہو تو کہہ دیا کہ بوا بیٹا بیٹی کا دینا آنکھوں سکھ کیجیے جنہیں دکھنے کی خیر منانی ضرور ہے۔ کہنے کلو تو میں اتنا کہہ گز ری مگر پیچھے مجھ کو پچھتا وابھی آیا۔ سلمی کی بہن دل میں کہتی ہو گئی کہ استانی جی الیما ایک ندینا دن حق بھانجی مارتی ہیں۔

محمد کامل کی ماں نے کہا ’ہاں، تج بے۔ مگر کم بخت دنیا میں رہنا بے۔ کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ ہو یا نہ ہو، کرنا ہی پڑتا ہے۔ دنیا کی تھی نہ کریں تو نکوناں بنے انگشت نما کون ہو۔ میں نے مواوی اسحاق صاحب کے درس میں سنا تھا کہ اگلے دوتوں میں عرب کے لوگ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مارڈا لتے تھے۔

صغری: اماں جان، دور کیوں جاؤ ہمارے ملک میں راجپوت بھی تو یہی کرتے تھے۔ اب انگریزوں کی روک ٹوک سے بندی ہوئی۔ اس پر بھی کئی دفعہ بھنک پڑی بے کہ چوری چھپے خون ہوئے۔ محمد کامل کی ماں: عقل کیا کرے، غیرت قبول نہیں کرتی۔

صغری: غربت میں غیرت کی کیا بات ہے؟ دنیا میں غریب لوگ زیادہ ہیں۔ غریب ہونا غیرت کی بات ہے تو دنیا میں بے غیرت بہت ہیں۔ امیری غربتی سب اپنی اپنی قسمت ہے۔ سب کیساں کیوں نکر ہو جائیں۔

محمد کامل کی ماں: اے بے! با سے شادی بیاہ میں بہت خرق کرنے کی تو سرکار سے مناہی ہو جاتی تو جملگڑ امانتا۔

صغری: اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کچھ بندو بست کرنے والے ہیں۔ ہمارے شہر کے رئیس بھی تو بalaے گئے تھے۔ سنا بے خرق کی ایک حد بندھ گئی ہے۔ مہر کا انداز مقرر ہوا ہے۔ مگر یہ کام ہم لوگوں کے کرنے کے ہیں۔ سب ایکا کر کے جتنے خرق فضول ہیں موقوف کریں۔

محمد کامل کی ماں: خرق کے فضول ہونے کی جو تم نے کہی تو جس کا خدا نے دیا ہے، اس کے نزدیک تو کچھ فضول نہیں۔ باں، جس کے پے کوڑی نہیں، اس کو تو سمجھی فضول ہے۔

صغری: یہ نہ فرمائیے۔ شادی بیاہ میں تو واجہی خرق کم ہے۔ فضول باتوں میں بہت روپیہ اٹھ جاتا ہے۔ ہمارے خاندان میں تو ناق، تماشا، باجا، گانا، آتش بازی، نوبت نقادر کچھ ہوتا ہوا تھا نہیں، مگر جن کے باں ہوتا ہے، اس میں سینکڑوں ہزاروں پر پانی پھر جاتا ہے۔

محمد کامل کی ماں: ناق، تماشا جن کے باں ہوتا ہو وہ جانیں۔ بھلا ہمارے باں کوں سا فضول خرق ہے۔

صغری: کیوں نہیں؟ منگنی، تج تیو بار ساچق، مہندی، برات، پیاز، چوتھی چالے، بہت بھاری بھاری جوڑے، جراو، گہنا، سمجھی

فنسول بے۔

محمد کامل کی ماں: تو سیدھی یہیں ایک بات کیوں نہیں کہتیں کہ سرے سے بیاد ہی فنسول بنے؟ اصغری ہنسنے لگی اور کہا کہ بیاد تو فنسول نہیں، اس کے لازمے البتہ حق کے ڈھکو سلے ہیں۔

محمد کامل کی ماں: بھلا رسمیں تو رسمیں تم کپڑے اور زیور کو بھی فنسول بتاتی ہو۔

اصغری: نرے کپڑے اور زیور تو کام کی چیز ہے۔ مگر بھاری جوڑے آپ ہی انصاف فرمائیے کس کام آتے ہیں۔ خود میرے جوڑے پڑے گلتے ہیں۔ گھر میں پہنچنے سے دل کڑھتا ہے۔ کبھی کبھار شادی بیاد میں پہن گئی۔ عید بقر عید کو ذرا کی ذرا نکلے۔ باقی بارہ مہینے گھٹڑی میں بندھے رکھے ہیں۔ آئے دن دھوپ کا دینا مفت کا دردرس۔ اور جو یعنی پھتوں مال کا مول نہیں ملتا۔ مصالحے کے دام تک کھرے نہیں ہوتے۔ اور یہی حال جڑ اوزیور کا ہے۔ معاوی غایمت اللہ کی بیٹی کا بیاد آپ نے سنابے؟ بس ایسے بیاد مجھ کو پسند ہیں۔

محمد کامل کی ماں: کون معاوی غایمت اللہ!

اصغری: لڑکیوں کے مدرسے کے افسر۔

محمد کامل کی ماں: وہ تو شاید شہر کے رہنے والے نہیں ہیں۔

اصغری: نہیں۔ آگرے کی طرف کے رہنے والے ہیں۔ یہی بچوں کو اپنے پاس بانیا ہے۔ بیٹی کی منکنی اسی شہر میں کی تھی۔ یہی کی مرضی یہی کہ اپنے شہر میں جا کر بیٹی کا بیاد کریں۔ بیان سے برات جائے۔ معاوی صاحب نے یہی کو سمجھا بچما کر راضی کر لیا۔ ایک دو دن چار میل ملاپ والوں کو بلا بھیجا۔ مہمان جو گھر پہنچے تو سنا کہ بیٹی کا نکاح بے۔ تھوڑی دیر بعد سہمی لڑکے کو ماتھے آ موجو ہوئے۔ شریع محمدی نکاح پڑھا دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ دان جیز جم ہی جم دیا۔ نکاح کے پانسو روپے نقد معاوی صاحب نے بیٹی داماد کے آگے لا کر رکھ دیئے اور کہا کہ بس بھائی، میری کمائی میں تمہاری تقدیر کا اتنی قدر تھا۔ اگر میں چاہتا تو اس میں مہمان داری بھی کر دیتا اور دنیا کے دستور کے موافق ایک دو بھاری جوڑے بھی بنالیتا۔ مگر میں نے سوچا تو یہی معلوم ہوا کہ نقد روپیہ تم کو دینا بے۔ اب تم جس طرح چاہو اس کو کام میں لاو۔

محمد کامل کی ماں یہ سن کر بولیں ”ہاں پر دلیں میں معاوی صاحب جو چاہتے ہے تو کرتے۔ کہنے سننے والا کون تھا۔“

اصغری: کیوں؟ کہنے سننے والی یہی۔ اور پر دلیں پر کیا موقوف بے بہت چاہیے۔ کرنے والا ہو تو شہر میں بھی کر گزرے کہنے والوں کو بکھنے دیا۔ اپنے کام سے کام۔

محمد کامل کی ماں: کیا تم نے محمود کا اسی طرح کا اونچتا اوس نکاح تجویز کیا ہے؟

اصغری: بے شک میں تو لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں کرتی۔ میرا بس چلے تو محمود و کانکاح غایت اللہ کی بیٹی کا جواب ہو۔ انہوں نے دوچار مہمان بائے تھے اور میرے زندیک اس کی بھی ضرورت نہیں۔

محمد کامل کی ماں: نہ بوا، خدا کے لیے ایسا غصب تو مت کرنا۔ اس بڑھاپے میں میری تو بہن ایک بچی بیا ہے کوئے۔ اب کیا میں قبر سے کسی کا بیاہ برات کرنے پھر آؤں گی؟

اصغری: نہیں ایسا تو میرا ارادہ نہیں بے۔ مگر البتہ یہ بات ضرور میں نے اپنے دل میں ٹھان رکھی بے کہ نہ تو ایک بیسی قرض لیا جائے اور نہ کوئی جانتی اگر وہی رکھی جائے۔ جو کچھ اس کے نام کا رکھا رکھایا ہے اور جو کچھ اس کی تقدیری سے تین وقت پر ہو جائے، بس کافی ہے۔

محمد کامل کی ماں: سبحان اللہ ایسا ہو تو کیا بات بے، مگر جب دوسرا طرف والے بھی ہامیں بھریں۔

اصغری: اور اگر وہ راضی ہو جائیں؟

محمد کامل کی ماں: ان کا راضی ہونا کیا بلسمی ٹھٹھا ہے؟ اللہ آمین کا ایک تو بیٹا نہیں معلوم کیا کیا حوصلے ان کے دلوں میں ہیں۔ وہ تو برادر کی نکر کا گھردیجہ کر بات کریں گے اور سب ارمان نکالیں گے۔

اصغری: جب سے میں سیاگلوٹ سے آئی ہوں، اس بات کی تدبیر کر رہی ہوں۔ ادھر سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ ابھی جمال آرا اور حسن آراجھاگی ہوئی آئی تھیں۔ چھوٹے حکیم صاحب کو بھی منظور ہے۔ شاد مانی نیگم نے اپنی بیٹی کے واسطے بہت بہت تدبیریں کیں۔ خدا کے فضل سے کوئی کارگر نہ ہوئی۔ اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ پرسوں دن بھی اچھا ہے۔ ادھر سے مٹھائی آ جائے۔ بات پکی ہو جائے پھر بیاہ کو دیکھا جائے گا۔

محمد عاقل کی ماں یہ سن کر حیران رہ گئیں اور کہا ”بات تو بہت اچھی ہے۔ ہماری لیاقت سے کہیں زیادہ بے۔ لیکن ان کے لاائق سامان ہونا ہم سے مشکل ہے۔“

اصغری: خدا مسبب الاصباب ہے۔ جب محمود کی تقدیر ایسے اوپنچے گھر لڑی بے تو خدا اپنی قدرت سے وقت پر کچھ سامان بھی کر دے گا۔

محمد کامل کی ماں: اپنے سرے کو آنے والوں مٹھائی کے واسطے ان سے پوچھا دوں۔

تحوڑی دیر بعد مولوی صاحب آئے، ملتانی کا حال سن کر بہت ہی خوش ہوئے اور کہا ”بے تامل پرسوں مٹھائی آئے۔“

اصغری نے حسن آرا کو کہلا بھیجا۔ روز مقررہ پر پانچ ان مٹھائی اور سورو پے آ گئے۔ ادھر سے سو اسون مٹھائی اور سو سورو پیسے گیا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت ہو گئی۔

محمودہ کا بیاہ

منگنی کا ہونا تھا کہ چھوٹے حکیم صاحب نے بیاہ کا اتنا اپنا شروع کی اور مولوی صاحب سے کہا۔ بھیجا کہ مدت سے میرا ارادہ حج کے جانے کا بے اور صرف اتنی وقت کا انتظار ہے۔ زندگی کا انتباہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ رجب کے مہینے میں عتمد ہو جائے۔ مولوی صاحب نے اصغری سے پوچھا۔ اصغری نے کہا ”بانفعل یہ کہا۔ بھیجا چاہیے کہ ہم فکر میں ہیں۔ جہاں تک ہو سکتا ہے تدبیر کرتے ہیں۔ سامان منتظر ہو دینا منظور ہے اگر اس غرضے میں جمع ہو اجاتا ہے تو ہم کو بھی یہ فرض آخر دادا کرتا ہے۔ جس قدر جلد ہو بہتر ہے۔“ حکیم صاحب نے پھر کہا۔ بھیجا کہ میں نے جیز اور سامان کی امید سے آپ کے ہاں رشتہ نہیں کیا۔ مجھ کو اڑکی چاہیے۔ آپ سامان کا فکر نہ کیجئے۔ ادھر سے جواب گیا ”بہت خوب۔ ہم کو بھی رجب میں عقد کر دینا منظور ہے۔“

ستائیں تاریخ رجب کی مقرر ہوئی اور دونوں طرف سے سامان ہونے لگے۔ سامان کا شروع ہونا تھا کہ مولوی صاحب کو فکر پیدا ہوا۔ کبھی کہتے تھے۔ ہزاری میل سے قرض الوں، کبھی سو پتے گھنی کا کٹرانچ ڈالوں یا گروی رکھدوں۔ اصغری نے مولوی صاحب کو یوں پریشان دیکھ کر پوچھا ”آپ نے کیا تدبیر کی ہے؟“

مولوی صاحب نے کہا ”کیا بتاؤں شادی کی تاریخ سر پر چل آتی ہے اور روپے کی صورت کہیں سے بن نہیں پڑتی۔ ہزاری میل سے میں نے روپیہ مانگا تھا۔ وہ بھی ٹال گیا۔ گھنی کے کٹرے کو جدا کر دینے کا ارادہ کیا تھا۔ کوئی خریدار نہیں کھڑا ہوتا۔“

اصغری نے کہا ”ہرگز ہرگز آپ قرض نہ لیجئے اور نہ جانیدا فروخت کیجئے۔ قرض سے بدتر کوئی چیز نہیں اور جانیدا کا جداب ہونا کیا مشکل ہے۔ لیکن اس کا بھم پہنچنا بہت دشوار ہوتا ہے۔“

مولوی صاحب: قرض تو الوں نہیں اور جانیدا کو جدانہ کروں تو کیا میں کیا گر ہوں یا دستِ غیب جانتا ہوں؟ روپیہ کہاں سے آئے؟“

اصغری: پہلے گھر کا حساب دیکھ لیجئے۔ کپڑے تو کچھ پہلے سے تیار ہیں۔ صرف تھوڑا سا مصالحہ درکار ہو گا۔ سو میرے جوڑوں میں بعض بہت بھاری ہیں۔ ان میں سے کم کر کے اتنا مصالحہ نکل آئے گا کہ محمودہ کے جوڑوں کو کافی ہو جائے گا۔ برتن موجود ہیں۔ کوئی مول لیما نہیں۔ کاش، کباڑ، سامان بالائی یہ سب میں اپنادے دوں گی۔ بے فائدہ پڑا پڑا خراب ہوتا

بے اور میر کے کسی مصرف کا نہیں۔ اور آخراً پے کے پاس بھی کچھ روپیہ لند ہو گا۔“

مولوی صاحب: صرف پانچ سور و پیہے بنے۔

صغریٰ: بس بہت بے۔ جب میں سیالکوٹ جانے لگی، مکتب کی رقم چار سور و پے تھی۔ وہ امانت رکھی بے۔ میرے پیچے دوسرو پیہے ادا ہوا۔ سو آدھا آپ کا حلقہ بنے اور سور و پیہے دوسرو پیہے اور ہوا۔ سو آدھا آپ کا حلقہ بنے اور سور و پیہے محمود کا۔ یہ ملا کر مکتب کی رقم کے پان سو ہو جائیں گے۔ محمود کے چھوٹے بھائی کو میں نے خط لکھا ہے۔ اس طور ڈیڑھ ہزار روپیہ لفڑاں وقت موبود ہے۔ ہزار کے کڑے جو حسن آر کے بیاہ میں مجھ کو ملے تھے۔ میرے کس کام کے ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ محمود کو چڑھا دوں۔ لیکن پھر غور کیا تو اتنی گھر کے کڑے اتنی گھر میں جانے مناسب معلوم نہیں ہوتے۔ میں ان کی بیج ڈاول گی۔ وہ تماشا خانم کی معرفت بازار میں بھیجے تھے۔ پناہ تیرہ سور و پیہے دیتا ہے۔ محمود کی تقدیر سے اگر کوئی حاجت مندل گیا تو انشاء اللہ پندرہ سو مل جائیں گے۔ اور ایک تدبیر یہ ہے میں آتی بے کا آپ بھائی جان کو لانے والا ہو رجایے اور رئیس پر رخصت کی تقریب میں یہ بات ظاہر کر دیجئے۔ رئیس برداشت یہ چشم بنے امید بے کہ ضرور کچھ مدد کرے گا۔ ہمیشہ سے ہندوستانی سرکاروں کا دستور رہا ہے کہ ایسی تقریبیات میں اپنے معتمدنو کروں کی اعانت کی ہے۔

غرض اصغریٰ نے سرے کو لا ہو رجیحا۔ مولوی صاحب رئیس کے سلام کو جو گئے تو رئیس نے پوچھا ”مولوی صاحب کیوں کرتشریف لائے؟“ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ بندوزادی کا اعتناد ہے۔ اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ محمد عاقل کو ایک مینے کی رخصت مر جنت ہو اور یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ حضور کے خاندان سے کوئی شریک ہو لیکن اگر دیوان صاحب جو دلی میں ہیں، سرکار کی طرف سے زینت دیکھل ہوں تو ہم چشمیں میں میرے لیے افزائش آبرو کا باغث ہو گا۔“

رئیس نے محمد عاقل کی رخصت بھی منظور کی اور مولوی صاحب کو آنے جانے کا خرچ بھی دیا اور دیوان صاحب کو حکم بھیج دیا کہ ہماری طرف سے مولوی صاحب کی گھفل میں شریک ہوتا اور پان سور و پے شوت کا دیتا۔ اصغریٰ کی صلاح سے بیٹھے ہٹھائے یہ پان سور و پے مفت کے آگئے۔ ادھر جزا کڑے تماشا خانم کی معرفت نواب حاتم زمانی نیگم تک پہنچے۔ ویکھ کر الوٹ ہو گئی اور آنکھ بند کر کے دو توڑے ہو لے کیے۔ اب تو روپے کی ہر طرف سے ریل پیل ہو گئی۔ اصغریٰ کا اہتمام۔ عمدہ سے عمدہ جوڑے تیار ہوئے اور چوہراز یور بنا۔ وہ شادی ہوئی کہ مولوی صاحب کی توکی پیشتوں میں نہ ہوئی تھی۔ سہم دیا نے والے بھی سامان دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ جو سامان متعدد اور بیش قیمت اور جو چیز تھی نئے طور کی۔ دو جوڑے تو بیٹھے والوں کی طرف سے آئے۔ ایک ریت کے واسطے کر کری تاش کا۔ دوسرا چوتھی کے واسطے کار چوبی کا۔ اور گینہ جیز اور چڑھاوے کے ملا کر تو بے انتبا تھے۔ ناک میں نتھ اور کیل، ماتھے کو ٹیکا، جھومر، بنیا، کانوں میں بانی، پتے، جزا اور سادے چھپے کے

بائے کان کے جھالے، مگر، مرکیاں، بجلیاں، کرن پھول، جھمکے، گلے میں گلو بند، طوق، چپا کلی، لفٹھی، توڑا، دھگدگی، چندن بار، زنجیر مالا، بازو پر جوش، نور تن، بھون بند، نو نگے، باتھوں میں کڑے، نوگریاں، چوبے دتیاں، لچھے، دست بند، انگلیوں میں انگوٹھی، چھٹے، جوڑ، پاؤں میں پاز بب، چوڑیاں، چنکی چھلتے، کارچوبی، جال دار، مصالحتے اور سب مایا کر بچاں جوڑے۔ دوسو برتن اور اسی حیثیت کا بالائی سامان۔ غرض بڑی دھوم دھام سے عقد ہو گیا۔

محمود در خصت ہوئیں۔ تیر آستانی بیگم سرال سے خطاب ملا۔ حکیم فتح اللہ خان بڑے مقنی پر بیز گار بادخدا آدمی تھے۔ مدتوں سے حج کا ارادہ کرب ب تھے لیکن صرف ارجمند خاں کے بیاد کے منتظر تھے۔ اب بیاد ہونے کے بعد چند روز تک بہو کا رنگ ڈھنگ دیکھتے رہے۔ یہاں دیکھنے کی کیا حاجت تھی۔ محمود نے تو بی اصغری کی نگرانی میں تربیت پائی تھی۔ کسی طرح کی کوئی کسر اس میں باقی نہ تھی۔ حکیم صاحب نے جس قدر آزمایا، بہو کو بس مرمند، عاتا، سایقہ شعار پایا، کچھ تو خر بوزہ میٹھا اور کچھ اوپر سے مانند۔ اول تو محمود وہ اپنی ذات کی اچھی اور اس پر اصغری کی تعلیم کی صلاح۔ بھلا پھر کیا پوچھنا تھا۔ غرض حکیم صاحب کو خوب یقین ہو گیا کہ تیر آستانی بیگم اچھی خاصی طرح گھر کو سنبھال لیں گی۔ اب حکیم صاحب نے یہاں کیک زور شور کے ساتھ عرب جانے کی تیاریاں شروع کیں۔ یا تو حج کی نیت تھی یا بھرت کا ارادہ کر لیا۔ نقد کی قسم سے جو کچھ تھا اپنے ساتھ لیا۔ مکانات، دکانیں، کھڑے، گنچ، دیہات، سرائیں سب کچھ بیٹے کے نام لکھ دیا۔ رشتہ ناتے کے لوگوں نے جیسا دستور بہ، سمجھایا بھی لیکن حکیم صاحب کو تو خدا کی دھن تھی۔ ایک نہ سنی۔ خدا کا نام لے چل کھڑے ہوئے اور دنیا بھر کی جانبیاد بیٹے بہو کو دے گئے۔

محمود اگر چ بیا ہی جا چکی تھی لیکن پھر بھی اصغری کا ادب لحاظ پبلے سے زیادہ کرتی تھی۔ ذرا ذرا بات میں اصغری سے صلاح یقین۔ اب البتہ اصغری کو اپنی عتعل آزمانے کا موقع ملا۔ بڑا کارخانہ بڑے کام و وہ انتظام کی یہ کہ ارجمند خاں کو خدا جھوٹ نہ بلوائے وقت کا بادشاہ، وزیر بخوا دیا۔ کوئی سر کار اس کے مقابلے کی دیلی کیا دورو رونہ تھی۔ ابھی تک تو اصغری منسی میں تھی۔ از دست بستہ چ خیر واڑ پائے شکستہ چ سیر۔ لیکن اب خدار کھے دولت و ثروت نصیب ہوئی۔ انتظام کا قابو بند و بست کا موقع مکن مانا ملا۔ اس حالات میں جو جو کام اس عورت کے کیے، اللہ چاہے تو قیامت تک یاد گار ہیں گے۔ مگر افسوس بے کان کے لکھنے کی فرصت نہیں۔ پھر بھی اگر نصیحت مانے والا اور بات کا سننے اور سمجھنے والا ہو تو جس قدر لکھا جا چکا کشم نہیں۔ ہر طرح کی صلاح، ہر قسم کی تعلیم اس میں موجود ہے۔ کہنے کو قصہ اور حکایت بے لیکن حقیقت میں نصیحت اور ہدایت۔

اولاد کے تعلق پر ایک عمدہ نصیحت

اب اس کتاب کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور لکھنی ضرور ہے۔ وہ یہ کہ اصغری بہت چھوٹی سن عمر میں ماں بن گئی تھی۔ ابھی تک کچھ اس کی اولاد کا تذکرہ نہیں ہوا۔ اصغری کے بچے تو بہت ہوئے لیکن خدا کی قدرت زندگی رہے۔ صرف ایک بڑا کامِ مکمل جو آخر میں محمودہ کی بیٹی مسعودہ سے بیان ہا گیا، زندگی رہا۔ یہ بڑا کئی بچوں کے اوپر پیدا ہوا۔ اس سے پہلے محمد عادل ایک بیٹا اور بتول ایک بڑی مرچکے تھے۔ بچوں کی پرورش میں احتیاط تو بتیری ہوتی ہے۔ سردی گرمی کا بچاؤ۔ کھانے تک کا وقت بندھا۔ اندازہ اور خبرداری یہ کہ ثقلیل اور ردی چیز کہیں منہ نہ ڈال لیں۔ دانت نکلنے شروع ہوئے اور مسوڑوں میں نشتر دیا گیا کہ ایمانہ ہو دنقوں کی تکلیف کو بچہ سہا نہ سکے۔ چار برس کے ہوئے اور پیچکے بچاؤ کی نظر سے یہاں لگوادیا گیا۔ جہاں تک آدمی کی عتمل کام کرتی ہے، سب طور کا بندو بست کیا جاتا تھا لیکن قدری کے آگے کسی کی حکمت نہیں چلتی۔ محمد عادل چار برس کا ہو کر مرا۔ پچھل ہوئی۔ دست بند کرنے کی دوادی۔ بخار آنے لگا۔ سر سام ہو گیا پلا پلا یا بڑا کا باہتھ سے جاتا رہا۔

ابھی اس کا داشتاز و تھا کہ بتول سات سال برس ہو کر یہاں پڑی۔ کچھ ایسے بنا کے دست چھوٹے کہ جان لے کر بند ہوئے۔ دنیا جہاں کی دوائیں کیں۔ لیکن موت کب مانتی ہے دو اکو۔ ایک ہی بہتے میں بڑی تخلیل ہو کر چلی گئی۔ بتول کے مرنے کا اصغری کو بہت بڑا اصد梅ہ ہوا۔ اول تو بڑی، دوسرا پر کچھ مرنے والی تھی یا کیا ایسی ماں پر فریغ تھی کہ ایک دم الگ نہ ہوتی تھی۔ ماں نماز پڑھتی ہے تو جائے نماز پر بُٹھی ہے۔ ساتھ سوتا، ساتھ اٹھنا۔ ماں کی دوائیکو چکھ لینا ضرور۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں بس پڑھنے میں دھیان۔ قرآن کا ترجمہ شروع تھا۔ جب محمد عادل مرا تو عورتوں نے اصغری کے ایمان میں خلل ڈالنا شروع کیا تھا۔ کوئی کہتی کوکھ کا خلل ہے، قہر علی شاد کا علان کرو۔ کوئی کہتی دودھ پر نظر ہے، چورا ب میں اتار رکھواؤ۔ کوئی کہتی مسان کا دکھ بے، رمضان شاہ سے گڑا نت کراؤ۔ کوئی کہتی مکان اچھا نہیں، میر غایم سے کلواؤ۔ کوئی کہتی سفر میں آئی گئی ہو، کوئی چڑیل لپٹ گئی ہے۔ کچھ چھچھ چلو۔ گندے اور تھویز، عمل ٹونے اور ٹوٹنے تو دنیا جہاں کے لوگ بتاتے تھے لیکن وادری اصغری! یوں اوپر تلے دو بچے مرے لیکن سدا خدا اپر شاکر رہی۔ کسی نے کچھ کہا بھی تو یہی جواب دیا۔ ”خدا کو جب منظور ہو گا تو یوں بھی فضل کر سکتا ہے۔“ بتول کے مرنے کی خبر جب دوراندیش خال صاحب کو ہوئی تو بہت منظر ب ہوئے اور اس اضطراب میں بیٹی کے نام یہ نظر لکھا۔

خط

برخوردار اصغری خانم کو دعا کے بعد معلوم ہوا کہ اس وقت دہلی کے خط سے مجھ کو بتوں کے انتقام کا حال معلوم ہوا۔ میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھ کو رنج نہیں ہوا۔ مگر میری عقل اس قدر بے جانیں ہوئی کہ تا دن آدمیوں کی طرح بے صبری کروں۔ مجھ کو بڑا تر دو تھا را بے۔ عجب نہیں تم پر یہ صدمہ بہت شاق ہوا ہو۔ لیکن ہر حالت میں انسان کو عقل سے مشورہ لینا چاہیے۔ عقل ہم کو اتنی واسطے بخشی گئی بے کہ رنج ہو یا خوشی، ہم اپنی عقل سے اس میں مدد لیں۔ دنیا کے حال پر غور کرنا نہایت ضرور ہے اور یہ غور فائدے سے خالی نہیں۔ زمین، آسمان، پیاز، جنگل، دریا، انسان، حیوان، درخت لاکھوں طرح کی چیزیں دنیا میں ہیں اور دنیا کا ایک بہت بڑا بھاری کارخانہ ہے۔ دن میں ایک معمول کے ساتھ آفتاب کا چکنا پھر رات کو ہوتا اور چاند ستاروں کا چکنا۔ بھی گرمی، بھی سردی، بھی برسات اور پانی کے اثر سے انواع و اقسام کے رنگ برلنگ پھلوں کا پیدا ہوتا اور ایک وقت خاص تک تاز و شاداب رہ کر مر جھانا اور ناپید ہو جاتا۔ ہر ایک بات غور کرنے والے کو برسوں تک سوچنے کو کافی ہے۔ خود آدمی کو اپنا حال غور کرنے کو لیکا کم ہے۔ کیوں کہ آدمی پیدا ہوتا اور کیوں کہ پرورش پاتا اور بڑا ہوتا اور کیوں کہ بڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے کی حالتیں اس پر گزرتی ہیں اور کیوں کہ آخر اس دنیا سے سفر کر جاتا ہے۔ یہ بڑا اندھا اور بچپ اور مشکل مضمون ہے۔ یہ سب کارخانے کی مصلحت سے خدا نے جاری رکھا ہے اور جب تک دوچاہے کا اتنی طرح یہ کارخانے جاری رہے گا۔

دنیا کی مردم شماری سے ثابت ہوابہ کہ ایک گھنٹے میں ساڑھے تین ہزار آدمی کے قریب دنیا میں مرتے ہیں۔ یعنی ہر ایک پل میں ایک آدمی اور اسی قدر پیدا بھی ہوتے ہوں گے۔ اب حساب کر لو کہ ایک میٹنے میں کئی لاکھ آدمی دنیا میں مرتے اور پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر غور کرو کہ سات بزرگ برس سے یہیں لگا چا آتا ہے۔ یعنی بے شمار آدمی اس دنیا میں مرتے چکے ہیں۔ پس موت ایک معمولی اور ضروری بات ہے۔ بڑے بڑے زبردست بادشاہ بڑے بڑے عالم بڑے بڑے حکیم یہاں تک کہ بڑے بڑے پیغمبر، جنگوں نے مردوں کو زندگی کیا، خود موت سے نہ فجح سکے۔ دنیا میں جو پیدا ہوابہ یہ خدا کا ضرری حکم ہے کہ وہ ایک دن مرتے۔ پس اگر یہ حکم کسی دن ہم پر یا ہمارے کسی عزیز یا قریبیں پر جاری کیا جائے تو ہم کو شکایت اور فریاد کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ مضمون سرسری نہیں ہے۔ اس کو خوب غور کرو اور جب تم کو موت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی تو تمہی گی کہ کسی کے مرنے پر رنج کرنا تعلق پر موقوف ہے۔ اگر ہم سنیں کہ مثلاً ملک چین کا بادشاہ مر گیا تو ہم پر اس خبر کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ ہم کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ بلکہ محلے میں اگر کوئی غیر آدمی مر جائے، جس سے کسی قسم

کا واسطہ نہیں تو ہم کو بہت کم رنج ہو گا۔ بلکہ شاید نہ بھی ہو۔ غرض ہم کو رنج اسی شخص کے مرنے کا ہوتا ہے جس سے ہم کو تعلق بہے۔ اور جتنا تعلق قوی اسی قدر رنج زیادہ۔ نانی کی، جستچی کی، خالہ کی، بھوپلی کی، بھاجی اگر مرے تو کیا؟ دور کا واسطہ، دور کا رشتہ بلکہ رشتہ ناتے پر کیا موقف بہے، محبت ملاپ میں بھی رنج ہوتا ہے۔ اب سوچنا چاہیے کہ ہم کو کس سے زیادہ تعلق بہے، اس کے واسطے کوئی قاعدہ مقرر نہیں۔ قریب کا رشتہ ہوا اور سدا کی لڑائیاں، بیشہ کے بگاڑ تو ایسے رشتے دار غیر داخل۔ لیکن غیر سے رشتہ نہیں، قرابت نہیں لیکن محبت ملاپ بہت کچھ تو درشتے داروں سے بڑھ کر ہے۔ پس ہر ایک شخص موافق اپنے حالات کے خاص تعلق رکھتا ہے۔ یہ دنیاوی تعلقات سب فائدے اور غرض سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انہاں کا ہمارے فائدے میں خلل انداز ہو، ضرور بہ کہ ہم سے چھوٹ جائے۔ اسی طرح اگر غیر آدمی ہمارے کام آئے، ضرور بہ کہ ہم کو مثل اپنوں کے عزیز ہو۔ لیکن فائدہ جس سے تعلق پیدا ہوتا ہے، ضرور نہیں کہ صرف روپے پیسے کا ہو، اگرچہ اکثر اسی قسم کا ہوتا ہے۔ کبھی امیدوار اور تو قیمت سے بھی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ بہت لوگ ہمارے دوست ہیں جو ہم کو کچھ نہیں دے دیتے۔ لیکن یہ تو قیمت کہ اگر کبھی ہم کو کسی طرح کی ضرورت ہو تو یہ کام آنے والے ہیں، تعلق کے پیدا ہونے کی وجہ ہوتی ہے۔ میں اس بحث کو بہت طول دے سکتا ہوں اور جس قدر اس بحث کو طول دیا جائے، مناسب ہے۔ لیکن اصل مطلب میرا اس خط میں صرف اولاد کے تعلق سے بحث کرنا ہے۔ اور اگر فرصت ملے گی تو انشاء اللہ اس تعلق پر ایک کتاب لکھ کر تم کو بھیج دوں گا۔

یہ تعلق جو اولاد سے بہت عام ہے۔ کوئی ماں باپ بلکہ کوئی جانور تک اس سے خالی نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف فائدے اور غرض پر اس کی بنا نہیں بلکہ خداوند عالم جو بڑا داشت مند ہے، اس کا انتظام چاہتا ہے کہ ضرور ماں باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہو۔ اولاد چند سال تک مرتباً پرورش ہوتی ہے تاکہ اس کی پرورش اچھی طرح ہو۔ ماں باپ کو اولاد کی محبت لگادی کہ اس محبت کے تناقض سے بچوں کو پالیں اور بڑا کریں۔ یہاں تک کہ بڑے ہو کر خود دنیا میں رہنے سہنے لگیں، یعنی ماں باپ پرورشِ اولاد کے واسطے ان کے خدمت گزار رہیں۔ پس اولاد کا پال دینا صرف اتنا تعلق تو خدا کی طرف سے ماں باپ کو دیا گیا، باقی یہ بکھیرے کہ اب اولاد کی تمنا ہے، نہیں تو دوا اور علاج ہے، تعمید گذرا ہے، عمل ہے اور دعا ہے۔ یا اولاد ہوئی تو یہ فکر ہے کہ بیٹھے ہوں یا بیٹیاں نہ ہوں یا جو ہوں زندہ رہیں۔ یہ خود انسان کی اپنی ہوں کے طمع ہیں۔ رہی یہ بات کہ اولاد کی تمنا جو خدا کی مرضی سے زیادہ اپنے دل میں پیدا کی کس وجہ سے ہوتی ہے؟ بے شک فائدے اور غرض کے واسطے ہوتی ہے۔ لیکن فائدے کی قسم کے ہیں۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اولاد سے نام چلتا ہے۔ بعض کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارا مال و دولت ہمارے بعد لیں گے۔ اب ان خیالات پر غور کرو۔ کس قدر رہے ہو دا اور غلط ہیں۔ نام چنان کیا معنی کہ لوگ یہ جانیں

کے فلانے کے بیٹے فلانے کے پوتے ہیں۔ اول تو جب ہم خود دنیا میں نہ رہتے تو اگر کسی نے ہم کو جانا تو کیا، نہ جانتا تو کیا۔ علاوہ اس کے غور کرو کر کہاں تک نام چلتا ہے۔ کسی آدمی سے اس کے باپ دادوں کے نام پوچھو۔ شاید دادا تک تو سب کوئی بتا سکے گا۔ اس سے اوپر خود کو نہیں معلوم کہ ہمارے پڑا دادا اور سگو دادا کون بزرگ تھے۔ دوسرے لوگوں کو ان کے مردوں کی بذریاں اکھاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس بالفرض نام چاہی تو ایک یادو پشت۔ آگے خیر صلاح۔ اور ایک یادو پشت نام چنا بھی صرف خیالی بات ہے۔ دس برس سے میں پیارا ہوں۔ ہزاروں آدمی مجھ کو جانتے ہیں اور میں ہزاروں کو جانتا ہوں۔ لیکن نہ وہ میرے باپ کو جانیں اور نہ میں ان کے باپوں سے واقف۔ نہ کچھ باپ کا نام بتانے یا پوچھنے کی کبھی ضرورت واقع ہوتی ہے۔

دوسری وجہ تمنائے والا دلکی یہ فائدہ ہے کہ بڑھاپے میں مد گار ہوں۔ سو یہ بھی خیال دا ہیات ہے۔ یہ کیوں کریں گے۔ کہ ان کے بڑے ہونے تک یہ زندہ رہیں گے؟ اور بالفرض زندگی کا انتاق ہوا بھی تو اولاد کا مدد گار ہونا محض خیالی بات ہے۔ ان وقت میں ہم ایسی اولاد بہت کم پاتے ہیں جن کو ماں باپ کا ادب ملحوظ جن کو والدین کی خدمت گزاری کا خیال ہوتا ہے۔ ادب اور خدمت گزاری تو درکنار اب تو اکثر اولاد سے ماں باپ کو ایذا اور تکلیف پہنچتی ہے۔ جس اولاد کی لوگ تم ناکرتے ہیں، شروع سے آخر تک ان کے ہاتھوں سے رنج پاتے ہیں۔ جب تک چھوٹے ہیں پالنا ایک مصیبت۔ آن آنکھیں دھتی ہیں، کبھی پلی کا دکھ، کبھی دانت نکتھی ہیں۔ کبھی پیچک نکلی ہے۔ خدا خدا کر کے بڑے ہوئے تو ان کے کھانے کپڑے کا فکر۔ آدمی نہیں معلوم کن حالات میں ہے، نوکر یا نہیں۔ پیسہ پاس بے یا نہیں۔ ان کو جہاں سے ہو سکے، دینا ضرور۔ ماں باپ کو فاقہ ہو تو ان کو کچھ نہ ہو تو بھی سودے ساف کے لیے کہیں نہ کہیں سے روز کے روز پیسہ دھیا دینا یہی پڑتا ہے۔ عید ہو، بقر عید ہو، یو ہار ہو، لا و بھائی یا جوڑا۔ سودا کھانے کو جار مکے پیسے۔ یہاں تک بھی غیمت ہے۔ اب ماں باپ چاہتے ہیں کہ لڑکا کام لے کر پڑھے اور لڑکا ایسا پا جی بے کہ پڑھنے کے نام سے کوسوں بھاگتا ہے۔ جب تک مکتب کے چار لڑکے ناگ کرنے لے جائیں، قسم ہے۔ اور اگر کسی طرح گیا بھی تو طفل بے مکتب نہیں رو دو لے برندش۔ ذرا استاد کی آنکھ پر بھی کہیں چورا ب پر جائٹے، کہیں نہر پر کھڑے گیڑیاں کھیلتے ہیں۔ کہیں بازاروں میں خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ اور ذرا بڑے ہوئے تو ماں باپ کو جواب دینے لگے۔ بروں کی صحبت، بد معاشوں کا ساتھ نہ ناتھ کا پرہیز نہ بری صحبت سے گریز۔ باپ دادوں کو بد نام کرتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح بعض شاطر بدمعاش، پور جواری، شراب خوار ہو جاتے ہیں۔

اب اولاد بیا بنے کے قابل ہوئی۔ تمام شہر چھان مارا کہیں ڈھب کی بات نہیں ماق مشاطہ پاؤں توڑ توڑ کر دھمکی۔ میں ملاپ والے بار کر پیٹھ رہتے۔ کنبے کے لوگ ایک ایک سے کبھے چکے۔ کوئی بامی نہیں بھرتا۔ ایک خرابی میں جان بے۔ ماں

بے چاری کہیں نہیں مانتی پھرتی ہی، کہیں کھڑی فال گوش لے رہی ہے۔ کہیں گڑیا کایا دہور بابے۔ پانچوں وقت دعا بے۔ الہی غیب سے کسی کو بھیج۔ خدا خدا کر کے نسبت ناتا خبر اتو ایسی جگہ کہ ماں بے چاری کے پاس چاندی کا تار تک نہیں، سمدھیا نے والے جنکے بالے مانگتے ہیں۔ کسی طرح اپنے تینیں تیج، بیاد کیا۔ چڑیا کی جان گئی، کھانے والے کو مزانہ آیا۔ جبیز بے کہ پھنکا پھنکا پھرتا ہے۔ سمدھن کبھی بے ”اوی! کیا دیا۔ ایسی نہ ہوت میں بیٹی جنمی کیا ضرورت ہے؟“ کوئی خاطر نہیں آتی۔ بات بات میں طمعنہ بے، داما صاحب تشریف لائے تو ان کے دماغ نہیں ملتے۔ جب تک سرے سے جوتیاں سیدھی نہ کرالیں، ہاتھ تک نہیں ہوتے۔ کھانے کی کون کہے۔ چوتھی نہیں ہوئی کہ میاں یوی میں جوتی پیز ار ہونے لگی۔ بیٹی کی بیٹی دی، اڑائی کی اڑائی مولی۔ پھر یہ نہیں کہ کچھا یک دن کی بے۔ نہیں بس عمر بھر کو مصیبت کا چہ نہ چا۔ بیٹی کے اولاد ہونی شروع ہوئی۔ ماں بے داموں کی اونڈی بے تխواہ کی دایی۔ عمر بھرا پنچ پانے کی مصیبت چھیلتی رہی۔ اب خدا خدا کر کے دو برس سے آرام نصیب ہوا تھا کہ بیٹی کے چیغیں پوئے سنبھالنے پڑے اور اگر بہو آئی تو فساد کی گانٹھ۔ اڑائی کی پوٹ۔ سماں کی تو جوتی کے برادر نہیں سمجھتی۔ نندوں کا دم ناک میں کر کھا بے۔ نہ جینہ کا جا بے، نہ سرے کا ادب۔ عورت بے کہ مردوں کی گڑی اتارے یقین بے۔ خدا پناہ میں رکھے! بیٹی نالائق کو دیکھنے کے لئے بی نے تو آفت بر پا کر رکھی بے اور مردوں بی کی حمایت کرتا ہے اور اللام بآپ سے اڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بے چاری ماں اپ کو گھر چھوڑ کر الگ کرائے کے مکان میں جارتے۔ یہ نتیجہ اس وقت کی اولاد سے ماں بآپ کو ملتا ہے۔ بہت کم ہیں وہ لوگ جو اولاد سے راحت پاتے ہیں۔ پس ہم لوگ اپنی بے وقوفی سے اولاد کی تمنا کرتے ہیں۔ گویا آفت اور مصیبت کو آرزو کر کے باتے ہیں۔

اب رہا یہ خیال کہ ماں و دولت کا کوئی وارث ہو اس وجہ سے اولاد کی تمنا کی جائے۔ یہ خیال جیسا نہ مل اور پوچھ اور خرافات بے، ظاہر ہے۔ جب آدمی خود نیا سے اٹھ گیا تو اس کی دولت اگر اس کے بیٹے نے لی تو کیا اور اگر ماں لا اور ثقہ اپ کر سرکار میں گیا تو کیا۔ یہ دولت عاقبت میں کچھ بکار آمد نہیں، مگر اسی قدر جو خدا تعالیٰ کی راہ میں ہم خود صرف کر جائیں یا ہمارے بعد ہمارے نام سے خدا کی راہ میں صرف ہو۔ جب ہم نے دولت کو خود صرف نہ کیا اور ایسا ضروری کام اولاد کے ذمے چھوڑ گئے تو ہم سے زیاد کوئی حمق نہیں۔ جو اولاد ماں بآپ کا اند وختہ مفت میں پا جاتی ہے، ہرگز اس کو اس کے خرق کرنے میں دریغ نہیں ہوتا۔ آدمی اتنی روپے کی قدر کرتا ہے جس کو وہ خود اپنے قوت بازا و اور عرق ریزی سے پیدا کرتا ہے اور بے محنت جو روپیہ ملتا ہے اس کا حال یہی ہوتا ہے کہ ماں مفت دل بے رحم۔ البتہ اولاد تا ق رنگ، سیر تماش میں خوب دولت کو اڑائے گی۔ لیکن چاہیے کہ بآپ کے نام باجراء کے دلیے پر فاتح تک بھی دلائے کا کیا مذکور۔ کیا ایسی مثالیں دنیا میں سینکڑوں ہزاروں نہیں ہیں کہ لوگ مغل اور خست سے عمر بھر جمع کرتے رب اولاد نے دولت پاتے ہی وہ

گل جپرے اڑائے کہ چندروز میں باپ کا اندوختہ عمری فنا کر دیا؟

اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ جس قدر تعلق اولاد کے ساتھ ہم نے اپنے دل سے بڑھالیا ہے وہ ہمارے حق میں نہایت ضرر کرتا ہے۔ ہم کو اولاد کے ساتھ اتنی قدر تعلق رکھنے کا حکم ہے کہ جب تک وہ ہماری مدد کے متاثر رہیں، ان کی پرورش کریں۔ اور اس پرورش کرنے میں بھی اس امید کو دل میں جگہ نہ دیں کہ اولاد بڑی ہو کر پرورش کے عوض کبھی ہماری خدمت کرے گی۔ یہ امید پیدا کرنی سخت درجے کی نادانی ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا نے جو ہمارا ملک ہے، اس کی پرورش کی خدمت ہم سے متعلق کر دی ہے۔ ہم اولاد کے پانے میں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہ باش خدا کا بے اور ہم اس کی طرف سے اس باش کے مالی ہیں۔ اگر باش کاما لک کسی درخت کو قلم کرنے یا کاش ڈالنے کا حکم دلتے تو مالی کو یہ کہنے کا کب منصب ہے کہ میں اس درخت کو بڑی مخت سے پالا ہے۔ یہ کیوں کامٹا اور قلام کیا جاتا ہے؟ دنیا کے تمام تعلقات صرف اس واسطے ہیں کہ آدمی ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائے۔ ہم چندروز کے واسطے کسی مصلحت سے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں اور یہاں ہم کو کسی باپ، کسی بیٹا، کسی کا بھائی بنا دیا گیا ہے۔ اس واسطے کے لوگ ہماری اور ہم لوگوں کی مدد کریں اور صلح کاری اور سازگاری میں اپنی زندگی جو متر رکر دی گئی ہے پوری کر جائیں۔ دنیا ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہم کو کسی دوسری جگہ جا کر رہنا ہو گا۔ نہ کوئی ہمارا نہ کسی کے۔ ہم اگر کسی کے باپ ہیں تو صرف چندروز کے واسطے اور اگر کسی کے بیٹے ہیں تو بھی چندروز کے واسطے۔ اگر ہم کسی کو مرتد یا کھیس تو افسوس کی کیا بات ہے؟ افسوس تو توبہ کریں جب ہم یہاں بیٹھے رہیں۔ ہم کو خود ہی سفر درپیش ہے۔ نہیں معلوم کس گھری بادا ہوا اور چنان ٹھہر جائے۔ پھر سب سے مشکل یہ ہے کہ مرزا صرف یہی نہیں ہے کہ بدن سے روح ایک مکان میں چلی گئی۔ نہیں، ہبائ جا کر بات بات کا حساب دینا ہو گا۔ زبان جھوٹ اور غیبت اور قسم اور خیش اور بے ہودہ بکواس کے واسطے جواب دی رکے گی۔ آنکھ نظر بد کی سزا پائے گی، کام کو کسی بدی اور راگ سننے کے عوض گو شتمی دی جائے گی۔ باتھنے کسی پر زیادتی کی بے یا پر ایامال چرایا بے تو کام جائے گا۔ پاؤں اگر بے راہ چاہے تو شکنے میں کسا جائے گا۔ بڑا ٹیڑھا وقت ہو گا۔ خدا ہی اپنے فضل سے جیڑا پا کرے تو ہو سکتا ہے۔ جس کو ان باتوں سے فراغت ہو وہ کسی کے مرنے پر غم کرے یا کسی کے پیدا ہونے پر خوش ہو تو بجا ہے۔ لیکن دنیا میں کوئی ایسا بے جو اپنی عاقبت سے بے فکر ہو چکا ہو؟ اصغری! اپنی خبر اور اس دن کے واسطے سامان کرو جہاں سوائے عمل کے کچھ کام نہ آئے گا اور دعا کرو کہ خداوند عالم اپنے دوست صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہم سب کا انجام بخیر کرے۔

والد

گنبدگار دورانہ ایش خان

==☆☆==☆☆==☆☆==☆☆==